نمبر ۳	ستمبر ۱۹۳۱ء	جلد ۵۷

فہرست مضامین

تصاویر اعلیٰ حضرت نظام دکن اور لارڈ اِروِن۔ مرحوم مہاراجہ صاحب بنارس۔ مسٹر پی۔ سی راما سوامی لا ممبر گورنمنٹ ہند۔ ہز ہائینس سر آغا خاں۔

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

هز هائینس مہاراجہ پربھونراین سنگھ مرحوم والی بنارس

هز ایکسلنسي لارڈ اروِن سابق وایسرائے ہند اور اعلیحضرت نظام دکن

جلد ۵۷ ستمبر ۱۹۳۱

سلاطین عما…

(از سید احمد اللہ قادری نائب ایڈیٹر "تاریخ" حیدرآباد)

سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء – ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء) کے حملہ دکن کے بعد جنوب میں مسلمانوں کی جو سب سے پہلی سلطنت قائم ہوئی تھی وہ گلبرگہ کا عظیم الشان بہمنی خاندان تھا۔ اس میں بڑے بڑے زبردست فرمانروا پیدا ہوئے۔ بہمنی خاندان تقریباً ڈیڑھ سو سال تک نہایت جاہ و جلال کے ساتھ برسر حکومت رہا۔ نویں صدی ہجری کے اخیر زمانے میں کچھ ایسے انقلابات پیش آئے کہ یہ خاندان ختم ہوگیا اور اس کی وسیع مملکت پانچ چھوٹی چھوٹی بادشاہیوں میں تقسیم ہوگئی۔

۱- احمد نگر میں	نظام شاہی سلطنت	۸۹۱ھ / ۱۴۸۶ء	۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء
۲- بیجاپور میں	عادل شاہی سلطنت	۸۹۵ھ / ۱۴۸۹ء	۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۵ء
۳- برار میں	عماد شاہی سلطنت	۸۹۵ھ / ۱۴۸۹ء	۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء
۴- بیدر میں	برید شاہی سلطنت	۸۹۶ھ / ۱۴۹۰ء	۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء
۵ گولکنڈہ میں	قطب شاہی سلطنت	۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء	۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۶ء

ان حکومتوں کے بانی سلطنت بہمنیہ کے صوبہ دار تھے۔ جو ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ بن گئے اور کم و بیش دو صدی تک نہایت اطمینان کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے۔ ان کے حدود بہت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شمال میں ان کی عملداری کوہ بندھیاچل پر ختم ہوئی تھی اور جنوبی حد دریائے کرشنا

کے نیچے نیلور[۵۱] تک وسیع تھی۔ ان سلاطین میں سب سے پہلے احمد نظام الملک نے سنہ ۸۹۱ھ میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ اس کے بعد سنہ ۸۹۵ھ میں بیجاپور اور برار نے آزادی حاصل کی۔

شاہان برار بیجانگر کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباء و اجداد راجہ بیجانگر کی اولاد سے تھے۔ سلطان احمد شاہ بہمنی (سنہ ۸۳۸ھ ۱۴۳۴ء سنہ ۸۶۲ھ ۱۴۵۷ء) نے جب بیجانگر پر حملہ کیا تو اس خاندان سے ایک لڑکا مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوگیا۔ بادشاہ نے اس کو مسلمان کرکے فتح اللہ نام رکھا، بعد میں خانِ جہاں حاکمِ برار کے تفویض کیا۔ فتح اللہ چونکہ بادشاہ کا پروردہ اور منظورِ نظر تھا اس لئے خانِ جہاں نے اس کی نہایت احتیاط کے ساتھ پرورش کی۔ جب یہ بڑا ہوگیا تو اپنا معتمد خاص بنالیا۔ خان جہاں کے انتقال کے بعد یہ شاہی ملازمین کے زمرہ میں شامل ہوگیا اور بالکل قلیل عرصہ میں اس نے غیرمعمولی ترقی حاصل کرلی۔ خواجہ محمود گاواں بھی اس پر خاص طور سے مہربان تھا۔ چنانچہ اس کی سفارش پر اسے عمادالملک کے خطاب سے سرفراز کیا، اور خان جہاں کی برار والی خدمت بھی دے دی، جس کے بعد پھر یہ برار واپس چلا گیا۔

فتح اللہ عمادالملک کے برار جانے کے بعد خواجہ محمود گاواں کے قتل کا افسوسناک واقعہ پیش آیا خواجہ کے انتقال کے بعد سلطنت بہمنیہ سخت متزلزل ہوگئی اس کے اکثر صوبہ دار خودسر اور باغی بن گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمدنگر اور برار خودمختار ہوگیا۔

فتح اللہ عمادالملک نے سنہ ۹۱۶ھ میں انتقال کیا، وفات کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین عمادشاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے برار کی بجائے گاویل[۵۲] کو اپنا مستقر حکومت قرار دیا۔ اور عمادشاہ کا لقب اختیار کرکے خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا۔ اس کا زمانہ تاریخ میں باپ سے زیادہ روشن اور پرسکون گزرا ہے۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے احمدنگر پر یورش کی جس میں اسی کو نہایت بری طرح شکست ہوئی سنہ ۹۲۳ھ میں امیر برید والی بیدر نے قلعہ ماہور[۵۳] پر حملہ کیا اور خداوند خاں حبشی کو قتل کرکے قلعہ پر قابض ہوگیا۔ علاء الدین نے خداوند خاں کے لڑکوں کی حمایت میں امیر برید (سنہ ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء سنہ ۹۵۶ھ ۱۵۴۹ء) پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا مگر امیر برید کو جب اس کی خبر ہوئی تو بغیر لڑائی کے قلعہ خداوند خاں کے لڑکوں کو واپس کردیا۔

---

۵۱ یہ مقام بیجواڑے اور مدراس کے وسط میں ریلوے لین پر واقع ہے۔ بہت قدیم تاریخی شہر ہے

۵۲ برار کی ایک سرکار ہے جو پایان گھاٹ میں واقع تھا۔

۵۳ یہ تاریخی مقام اور برار کی ایک سرکار ہے جو بالاگھاٹ میں تھا۔

علاء الدین عماد شاہ کی لڑائیوں میں پاتھری[۵] کا سنہ ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء کا معرکہ دکن کی تاریخ میں غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ جس میں علاء الدین نے خاص امتیاز سے پاتھری کو برہان نظام شاہ (سنہ ۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء – سنہ ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء) سے دوبارہ مفتوح کیا تھا۔ اس کے بعد نظام شاہ نے علاء الدین کو شکست دی، جس میں اُسے مجبوراً برہانپور بھاگنا پڑا۔ میران محمد شاہ (سنہ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء – سنہ ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء) والی برہانپور سے اس کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے میران محمد شاہ نے علاء الدین کی خاطر بہ نفس نفیس برہان نظام شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دی۔ مگر خود اسی کی فوج کی غفلت کے باعث اُسے پسپائی ہوئی اور یہ برہانپور چلا گیا۔ اور عماد شاہ کاویل آگیا اس جنگ میں برہانپور اور برار کا بہت سا مال نظام شاہیوں نے تعاقب کرکے لوٹ لیا تھا، جس کی وجہ سے عماد شاہ اور میران محمد شاہ برہان نظام شاہ سے ناخوش ہوگئے تھے۔ میران محمد شاہ کے سلاطین گجرات سے بیحد تعلقات تھے اور گجرات کی قوت اس وقت بہت زبردست تھی۔ یہ سلاطین تیمور و اکبر کے ہم پلّہ تصور کئے جاتے تھے۔ میران محمد شاہ نے اپنی شکست کا حال بہادر شاہ گجراتی (سنہ ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء – سنہ ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء) کو لکھ بھیجا اور اُس سے امداد طلب کی۔ اس پر بہادر شاہ گجراتی خود بڑودہ میں آکر ایک عرصہ تک مقیم رہا، عماد شاہ نے بہادر شاہ کو دکن آکر احمد نگر کو فتح کرنے کے لئے راضی کیا، اور اپنے بیٹے خضر خاں کو سلطان کے لانے کے واسطے بھیجا۔ آخر بہادر شاہ ایک جرار لشکر کے ساتھ دکن کی سرحد میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے برار میں آیا، عماد شاہ نے برار کو نذرانے میں پیش کرکے شہر میں اُس کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور خود اُس کے امراء میں شریک ہوگیا۔ بہادر شاہ یہاں سے سیدھا احمد نگر کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا، مگر سلطان نے بعض وجوہات کے باعث احمد نگر پر یورش نہیں کی، بلکہ دولت آباد کو فتح کرنے کے ارادہ سے اورنگ آباد چلا گیا۔ راستہ میں اس کی فوج کے دستہ کو امیر برید نے پسپا کیا اور اس کے سپہ سالار عالم خاں میواتی کو قتل کر ڈالا۔ اس غیر معمولی واقعہ کے باعث برہان نظام شاہ کو بڑی پریشانی ہوئی اور اُسے یہ خیال پیدا ہوا کہ بہادر شاہ اگر اس کا کچھ بھی اثر لے گا تو احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ اس بنا پر اُس نے عماد شاہ اور میران محمد شاہ فاروقی کے پاس صلح کا پیغام بھیجا اور مفتوحہ علاقے و مال غنیمت واپس کرنے کا وعدہ کیا۔ علاء الدین بھی ان لڑائیوں سے بہت خستہ حال ہوگیا تھا، اس لئے موقع کو غنیمت جان کر صلح منظور کر لی۔ محمد شاہ فاروقی نے بھی اتحاد قائم رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر علاء الدین اپنا تمام سامان رسد قلعہ دولت آباد

---

[۵] یہ علاقہ بھی بالا گھاٹ میں تھا، عماد شاہ کے اجداد یہیں کے باشندے تھے۔

میں بھیجکر خود برار واپس آگیا۔ میران محمد شاہ نے بہادر شاہ کو محاصرہ اُٹھاکر گجرات چلے جانے کی رائے دی۔ اتفاق سے اِن دنوں میں برسات کا موسم بھی آگیا تھا غرض کہ ان عذرات کے باعث بہادر شاہ اپنے دار السلطنت کو واپس چلا گیا۔

سنہ ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء میں اسمٰعیل عادل شاہ (سنہ ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء سنہ ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء) نے اپنی بہن خدیجہ سلطانہ علاء الدین عماد شاہ کو بیاہ دی۔ علاء الدین کا سنہ ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں انتقال ہوا۔

سنہ ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں اس کا بیٹا دریا عماد شاہ تخت پر متمکن ہوا، یہ اپنے باپ کا صحیح جانشین تھا اُس نے اپنی لیاقت اور فراست سے ایسے بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے جو آج اصول حکومت کے لئے سرمایۂ ہدایت تصور کئے جاتے ہیں۔ سنہ ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں برہان نظام شاہ اول (سنہ ۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء سنہ ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء) نے ابراہیم عادل شاہ اول (سنہ ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء سنہ ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء) پر یورش کی جس میں بیجاپور کو سخت نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا۔ دریا عماد شاہ نے اُس وقت ابراہیم عادل شاہ کی بڑی مدد کی۔ اس کے ماسوا برہان نظام شاہ نے جب سنہ ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء میں انتقال کیا تو اس نے حسین نظام شاہ (سنہ ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء سنہ ۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء) کو احمد نگر کے تخت پر بٹھانے کے لئے خاص اثر اور قوت سے کام لیا اور اپنی بیٹی دولت شاہ کا بھی اُس سے عقد کر دیا، جس کے باعث برار اور احمد نگر میں ایک رشتہ قائم ہوگیا۔

سنہ ۹۶۴ھ میں شہنشاہ اکبر (سنہ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء سنہ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) نے باز بہادر بن شجاع خاں حاکم مالوہ کی سرکوبی کے لئے آدہم خاں کو روانہ کیا، آدہم خاں نے مالوہ آکر باز بہادر شاہ کو شکست دی اور ملک کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر دیا اس کے بعد آدہم خاں کی خدمت پر اکبر نے پیر محمد کو مقرر کر دیا پیر محمد بڑا سخت گیر اور عجلت پسند آدمی تھا۔ اُس نے مالوہ آنے کے بعد باز بہادر کا جو ایک چھوٹے سے علاقے پر حکمران تھا استیصال کر دیا۔ یہ یہاں سے پریشان ہوکر میران محمد شاہ کے پاس برہانپور آیا میران محمد شاہ نے دریا عماد شاہ سے مدد مانگی اور اُسے خاص طور پر آنے کے لئے لکھا۔ لیکن دریا عماد شاہ بعض وجوہات کی بنا پر خود نہ جا سکا بلکہ اپنے سپہ سالار تفال خاں کو روانہ کیا۔ میران محمد شاہ تفال خاں اور باز بہادر تینوں ملکر مالوے پر حملہ آور ہوئے اور پیر محمد کو نہایت بری طرح شکست دی۔

تفال خاں کے واپس ہونے کے چند دن بعد سنہ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں دریا عماد شاہ نے وفات پائی جس کے بعد اُس کا ہونہار فرزند برہان عماد شاہ (سنہ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں) جانشین ہوا۔ لیکن یہ ابھی کم سن تھا، اس لئے تفال خاں سلطنت کا کام دیکھتا تھا، جب یہ سن رشد کو پہنچا تو اس وقت بھی یہی سلطنت کی عقل کل تھا۔ کچھ مدت کے بعد اس نے تفال خاں سے اپنی موروثی سلطنت طلب کی اسپر تفال خاں

نے اسے بقول فرشتہ نرنالہ میں قید کر دیا۔ اس وقت احمد نگر میں حسین نظام شاہ کا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ برسر حکومت تھا اس سے اور دریا عماد شاہ سے بیحد دوستی تھی جب اس کو برہان کے مقید ہونے کا حال معلوم ہوا تو بہت غمگین ہوا۔ اور تفال خاں کے پاس اپنا سفیر بھیجکر برہان عماد شاہ کو اس کا موروثی تخت حوالہ کرنے کی سفارش کی، تفال خاں نے مرتضیٰ (سنہ ۹۷۲ھ / ۱۵۶۴ء — سنہ ۹۹۶ھ / ۱۵۸۷ء) کے کہنے پر کوئی التفات نہیں کیا۔ جس پر مرتضیٰ نظام شاہ نے ایلچ پور (برار) آکر تفال خاں کو محصور کر لیا۔ اور چنگیز خاں (وزیر مرتضیٰ نظام شاہ) نے سلطنت کو اتنا کمزور کیا کہ آئندہ مقابلہ کی مطلق طاقت نہ رہی ان کا بہت سامال و اسباب بھی لوٹ لیا۔ اور دو سو شتر، کئی جنگلی ہاتھی چھین لئے، تفال خاں مجبور ہو کر یہاں سے سیدھا گونڈوانہ کے جنگلوں میں فرار ہو گیا۔ مگر چنگیز خاں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اس طرح تعاقب میں چھ مہینے گذر گئے۔ آخر پریشان ہو کر یہ برہانپور بھاگ گیا۔ مگر مرتضیٰ نظام شاہ نے محمد شاہ فاروقی (سنہ ۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء — سنہ ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء) کو پناہ نہ دینے کے لئے لکھا جس کے باعث تفال خاں قلعہ نرنالہ میں محصور ہو گیا۔ اس کا بیٹا شمشیر الملک کاویل کے قلعہ میں آکر سامان جنگ فراہم کرنے لگا۔ لیکن چنگیز خاں نے کئی گھمسان لڑائیوں کے بعد دونوں قلعے فتح کر لئے۔ تفال خاں۔ شمشیر الملک۔ برہان عماد شاہ اور چند مخصوص لوگوں کو قید کر دیا۔ ان قیدیوں کی تعداد چالیس تھی جن میں تفال خاں کے عزیز و اقارب بھی تھے۔ یہ سب کے سب قید کی حالت میں ایک رات میں مر گئے۔

مورخین کا بیان ہے کہ ان کو ایک ایسے مقام میں بند کیا گیا تھا، جہاں ہوا کا مطلق انتظام نہ تھا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ مرتضیٰ نظام شاہ کے حکم سے یہ تمام کے تمام ایک ہی شب میں ختم کر دیئے گئے غرضکہ اس طرح ایک شاہی خاندان کا چراغ دنیا سے ہمیشہ کے لئے نہایت پرحسرت طریقے سے گل ہو گیا یہ واقعہ سنہ ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء کا ہے، برار میں عماد شاہی خاندان نوے (۹۰) سال تک برسر اقتدار رہا، اس کے بعد یہ ملک نظام شاہی بادشاہوں کے تصرف میں آیا۔

۱-	فتح اللہ عماد الملک	سنہ ۹۵ ۸ھ / ۱۴۸۹ء	جلوس	سنہ ۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء	وفات
۲-	علاء الدین عماد شاہ	سنہ ۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء	”	سنہ ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء	”
۳-	دریا عماد شاہ	سنہ ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء	”	سنہ ۹۶۹ھ / ۱۵۶۰ء	”
۴-	برہان عماد شاہ	سنہ ۹۶۹ھ / ۱۵۶۰ء	”	سنہ ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء	”
۵-	تفال خاں	سنہ ۹۶۹ھ / ۱۵۶۰ء		سنہ ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء	”

لہ برار کی ایک سرکار تھا جس میں ۳۷ محال تھے، علاقہ پایان گھاٹ میں واقع تھا۔

آگرہ
راجپوتانہ
مالوہ
مقبوضات سلاطین مغلیہ
گجرات
برہانپور
خاندیس
ایلچپور
گاویل
احمدنگر
ماہور
نظام شاہی
عمادشاہی
گونڈوانہ
بیدر
ورنگل
گولکنڈہ
قطب شاہی
مچھلی بندر
بیجاپور
عادل شاہی
بیجانگر

سنسکرت زبان اور اسکے کارنامے

(از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے صاحب جرنلسٹ)

ہندوستان میں یہ خیال عام ہے کہ سنسکرت مردہ زبان ہے اور مدت ہوئی کہ اس کے بولنے والے دنیا سے اُٹھ گئے۔ اب اس کی ہستی فقط ویدوں اور شاستروں ہی میں مقید ہے، اسے زندہ زبانوں میں شمار کرنا واقعیت سے انکار کرنا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت مردہ نہیں بلکہ زندہ جاوید زبان ہے اور پُرانی زبانوں میں یہی ایک ایسی زبان ہے جو اس وقت تک تمام دنیا کے علمی حلقوں میں مقبول عام ہے۔

سنسکرت کی فصاحت بیان نہایت ارفع اور بلاغت کلام بہت بلند ہے۔ اس کی لطافت سب سے شاندار اور شستگی عدیم المثال ہے۔ سنسکرت لٹریچر کی جامعیت اور وسعت دنیا کی ادبیات میں سب سے نرالی ہے۔ خیال اور معاشرت کا کوئی شعبہ اس سے علیحدہ نہیں رہا۔ اس کی قدامت ارباب تحقیق کے تجسس اور دماغ سوزی کے لئے ایک دلچسپ مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ یونانی اور لاطینی جو اس کی بیٹیاں سمجھی جاتی ہیں عرصہ ہوا نیست و نابود ہو چکی ہیں، ان کے بولنے والے مدت ہوئی دنیا سے اُٹھ گئے مگر سنسکرت کے بولنے اور ویدوں کی رچائیں روایتی طریقہ سے پڑھنے والے نہ صرف سرزمین ہند ہی میں پائے جاتے ہیں بلکہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں سنسکرت کے شائق طلبا اور اُستاد موجود ہیں سنسکرت کا چرچا آج بھی ایسا ہی ہے جیسا سکندر اعظم کے حملہ پنجاب کے وقت تھا۔ اُس نے ہزاروں انقلابات دیکھے، قومیں قعرِ ضلالت سے نکلیں، اقبال کے ساتویں آسمان پر سرفراز ہوئیں۔ کبر و نخوت کا تماشا دکھایا، پھر عدم آباد کو سدھار گئیں۔ سلطنتیں سربلند ہوئیں، اغیار کو پامال کیا، زوال سے دوچار ہوئیں، پھر ہمیشہ کے لئے مٹ گئیں، مگر سنسکرت اپنی جگہ پر بدستور قائم ہے، اس کا ستارۂ اقبال ابھی تک آسمانِ شہرت پر چمک رہا ہے۔ مغرب اور مشرق کی تمام یونیورسٹیوں میں اس کا بڑا چرچا ہے ہزاروں طلبا بڑے شوق سے اس کی تحصیل میں مشغول ہیں۔ صدہا استاد نہ صرف اعلیٰ تعلیم گاہوں ،

ہی نہیں اس کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں بلکہ بڑی دماغ سوزی اور سینہ کاوی سے اس کی تحقیقاتیں کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں اس کا چرچا سب سے زیادہ ہے۔ مگر برہما۔ سیام۔ چین۔ جاپان۔ فلپائن۔ جاوا۔ آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں ہزاروں طلبا اور استاد اس کی تحصیل و تعلیم میں مشغول ہیں۔ اس وقت بھی سنسکرت کے پرانے قلمی نسخوں کی نقل اور اشاعت کا کام صدہا کتب خانوں میں ہو رہا ہے اور استادانِ سنسکرت کی تحقیقات کے نتائج انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ قابل قدر پرانی کتابوں کے ترجمے دنیا کی تمام علمی اور ترقی یافتہ زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ مستند کتابوں کے مختلف نسخوں کا مقابلہ بڑی احتیاط سے کر کے صحیح اور مستند اڈیشن مرتب کئے جاتے ہیں۔ سال بسال سنسکرت کے مطالعہ اور تحقیقات سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ پرانے نسخوں کی تلاش میں بڑی سرگرمی ظاہر ہو رہی ہے اور ان کے حصول میں دولت صرف کی جاتی ہے۔ اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہے کہ مہذب دنیا کے ارباب تحقیقات السنہ کی جتنی تعداد سنسکرت کے کام میں مصروف ہے یونانی۔ لاطینی وغیرہ پرانی زبانوں کے کام میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ جن نازک خیال اور بالغ خرد رشیوں نے وید منتر بنائے تھے اور جو قواعد انھوں نے ان کی صحیح قرأت کے مرتب کئے تھے، ان کی اولاد میں ہزارہا پنڈت ایسے موجود ہیں جو آج بھی اپنے ابتدائی بزرگوں کی طرح اور انھیں کے انداز کے مطابق وید منتر پڑھتے رہتے ہیں۔ الیڈ اور آوڈیسے (یونانی) اور ورجل (لاطینی) کی رزمیہ نظمیں صحت و درستی سے پڑھنے والا ایک بھی نہیں ہے۔ یعنی مغرب کی ان تینوں مقبول عام رزمیہ تصنیفات کے مصنفوں کے ہم قوم اور ہمزبان عرصہ ہوا کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وجہ سے یورپ کے مختلف ملکوں کے علمائے یونانی و لاطینی اپنے اپنے میلان طبع کے مطابق تلفظ کرتے ہیں۔ لیکن وید، ویدانگ، براہمن، گرنتھ درشن اور دھرم شاستر صحت سے پڑھنے اور درست تلفظ سیکھنے کے واسطے ہزارہا آدمی غیر ممالک سے ہند کے پنڈتوں اور ودوانوں کے پاس آتے ہیں۔

مغرب کے مشہور مستشرقین کی آرا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سنسکرت ایک زندہ جاوید زبان ہے۔ پروفیسر اے۔ اے میکڈانل آکسفورڈ یونیورسٹی کے نہایت ممتاز ماہر سنسکرت اور متعدد کتب کے مصنف ہیں، آپ کا انتقال ہوئے تھوڑا عرصہ گذرا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے آپ کا قول ملاحظہ کیجئے:۔ "فی زمانہ سنسکرت ہزارہا براہمنوں کی زبان ہے، جو اس سے بلا تکلف اظہار خیال کا کام لیتے ہیں۔ علمی مطالب اسی کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں۔ رسالے اور کتابیں بھی اسی زبان میں طبع ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے کتب خانوں میں پرانی قلمی کتابوں کی نقل ہو رہی ہے۔ زمانہ قدیم و بعید کی طرح وید اس وقت بھی حفظ ہوتے ہیں اور پرانے دستور کے مطابق اچارن کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی آفت سے تمام مطبوعہ وید تلف ہو جائیں تو پنڈتوں[1] کے حافظہ سے از سر نو مرتب ہو سکتے ہیں"

[1] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" مصنفہ (مطبوعہ ۱۹۱۷ء)

ماہر موصوف ایک سے زیادہ مرتبہ سیاحت ہند کو آئے۔ مختلف صوبوں میں نامی پنڈتوں سے ملے، تبادلۂ خیال کیا اور چشم دید کوائف حوالۂ قلم کئے ہیں۔ ملک آسٹریا کے مشہور ماہر سنسکرت ڈاکٹر ونیٹرنٹس کی اُستادانہ رائے بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

"کوئی صاحب خرد سنسکرت کو مردہ زبان قرار نہیں دے سکتا۔ اس وقت کئی رسالے ملک ہند میں شائع ہوتے ہیں۔ معرکۃ الآرا مسائل پر بحث وتمحیص ان ہی رسائل کے وسیلہ سے ہوتی ہے۔ مہابھارت بر سر عام بآواز بلند پڑھی جاتی ہے، جو اس امر پر دال ہے کہ سامعین میں بعض لوگ اُسے تھوڑا بہت سمجھتے ہیں جب میں نے شانتی نکیتن مدراس اشمنس اور رام چرت کے پرانے ڈرامے ٹھیٹھ سنسکرت میں دیکھے جو وہاں کے طلبا نے مردوں اور عورتوں کے ایک شاندار مجمع میں دکھانے تھے تو مجھے یہ دیکھکر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ سامعین سنسکرت کے مکالمہ کا لطف اُٹھاتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اب بھی سنسکرت میں قصیدے کہے جاتے ہیں، کتابیں بھی لکھی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے ودوان اسی زبان میں نازک اور پیچیدہ مسائل پر بحث[۵] کرتے ہیں۔

ماہر موصوف بھی اور ممتاز ماہروں کی طرح ہندوستان کے ہر صوبہ میں سیاحت کر چکے ہیں۔ جو کچھ آپ لکھتے ہیں وہ ذاتی تجربہ کی بنا پر لکھتے ہیں، اس وجہ سے ان کی رائے بہت وقیع ہے۔

علاوہ بریں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تین مشہور رسالے سنسکرت میں شائع ہوتے ہیں۔ منجو بھاشنی (ہفتہ وار) کانجی ورم مدراس سے نکلتا ہے۔ سوریج اُدے، پندرہ روزہ ہے، اور سو بھارت (ماہوار) بنارس سے شائع ہوتے ہیں۔ ان رسالوں میں ادبیات کے گوناگوں پہلوؤں پر ہر قسم کے مضامین طبع ہوتے ہیں۔ مذہبی اور فلسفی اور مسائل سائنس کے قابل قدر مباحث پر بھی معرکۃ الآرا بحثیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ رسالوں سے قطع نظر ہر سال لاہور۔ الہ آباد۔ بنارس۔ کلکتہ۔ راجستھان۔ مدراس۔ تریوندرم، میسور، پونا، بمبئی اور بڑودہ میں سنسکرت کی سیکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ دھرم شاستر، ویاکرن، ڈراما، ادبیات اور فلسفہ پر مستند کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ یہ نشانات زندگی کے ہیں۔ سنسکرت کی ترقی کے واسطے امن وسکون کی فطری ضرورت ہے، اگر اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم الایام سے سنسکرت کی تمام معرکۃ الآرا اور غیر فانی کتابیں ایسے زمانہ میں تصنیف ہوئی تھیں جب ملک میں چاروں طرف امن کا دور دورہ تھا۔

یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ زبان سنسکرت کے جتنے قلمی نسخے اس وقت ملک ہند اور

---

[۵] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف انڈین لٹریچر" جلد اول صفحہ ؟

دوسرے ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی باقی متروک و مہذب زبانوں کی کتابیں مجموعی طور پر اس کا پاسنگ بھی نہیں ہونگی۔ اس سے ایک طرف تو سنسکرت کی زیست اور ہمہ گیری ظاہر ہے اور دوسری طرف اسلاف ہند کی علم پرستی اور ذوقِ شستہ عیاں ہوتا ہے۔ ذیل میں مطبوعہ کتابوں کا نہیں بلکہ ان پرانے قلمی نسخوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ جو دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر اس بات کا ذکر کرنا غیر موزوں نہ ہوگا، کہ ایشیائے وسطی کے وحشیوں نے جن میں ہُن سب سے بڑھے ہوئے تھے نہ صرف شاندار مندر اور سر بفلک محل مسمار اور منہدم کرکے اپنی فطری دحشت کا اظہار کیا تھا بلکہ کتب خانے بھی جلا دیئے تھے اور بیش بہا کتابیں ضائع کر دی تھیں جن کے حوالے دوسری کتابوں میں ملتے ہیں، اس کے باوجود لاکھوں کتابیں تباہی و غارتگری سے بچ گئی تھیں جواب دنیا کے شاندار کتب خانوں کی مایۂ ناز ہیں۔ ہزارہا کتابیں اغیار لے گئے۔ انگریز مورخ وی۔ اے اسمتھ رقمطراز ہے کہ "۶۴۵ء میں مشہور چینی سیاح ہیون تسانگ چھ سو ستاون (۶۵۷) قلمی نسخے کئی اونٹوں پر لاد کر ملک چین کو لے گیا۔ یہ غالباً بودھ مت کی کتابیں تھیں، لیکن ان کے منتشیٰ تلاش کرنا محال ہے اسی طرح ایک اور انگریز کا بیان ہے کہ" لاسہ پایہ تخت کے بڑے لامہ کے کتب خانے میں سنسکرت کی ہزارہا قلمی کتابیں موجود ہیں۔ جو ملک ہند کے بودھ پرچارک، پدم سم بھب اور اس کے ساتھیوں کی وساطت سے وہاں مہیا کی گئی تھیں"۔ چین کے عالم عرصہ دراز سے علوم ہند سے بے حد دلچسپی ظاہر کرتے چلے آتے ہیں، اس وجہ سے وہاں پر ہزارہا کتابیں سنسکرت کی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں جاپان ہند چینی، سیام اور جاوا و سماٹرا کے کتب خانوں میں بھی کئی ہزار قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ مہابھارت اور رامائن اور گیتا کی کتھا خاص تقریبوں پر کی جاتی ہے۔ کئی ماہروں کا بیان ہے کہ جاوا و سماٹرا میں جو مشہور دھارمک کتابیں اب پائی جاتی ہیں وہ ملک ہند کی مستند پرانی کتابوں سے کچھ مختلف ہیں۔ گویا ملک ہند کے علاوہ قرب و جوار کے ایشیائی ملکوں میں بھی سنسکرت کے ہزاروں قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کی معتبر فہرستیں موجود نہیں ہیں۔ البتہ ملک ہند اور یورپ کے مشہور کتب خانوں کے سنسکرت کے نسخوں کی فہرستیں مرتب ہوگئی ہیں۔ ذیل کے اعداد انھیں فہرستوں سے ماخوذ ہیں۔

یورپ کے جن عالموں نے مہارت سنسکرت کے واسطے دُور و نزدیک شہرت حاصل کر رکھی تھی ان میں میکس مولر کا نام سب سے ممتاز اور بہت وقیع ہے۔ اس نے ۱۸۵۹ء میں آکسفورڈ کے طلبا کے سامنے ہندوؤں کے علمی کارناموں پر لیکچر دیتے ہوئے بیان کیا تھا کہ "سنسکرت کے قلمی نسخوں کا

شمار دس ہزار ہے جو یونانی اور اٹلی کی پرانے زمانہ کی کتابوں کے مجموعہ سے کہیں زیادہ ہیں۔" یعنی میکس مولر کے زمانہ میں سنسکرت کی پرانی کتابوں کی تعداد یونانی اور لاطینی زبانوں کی قلمی کتابوں سے بیسوں گنا زیادہ تھی۔ یہ ستر سال پہلے کی کیفیت ہے۔ اس کے بعد بہت وسیع تحقیقات ہوئی بیسوں آدمی دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کی طرف سے نادر الوجود قلمی نسخوں کی تلاش میں ملک کے ہر حصے میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اسی طرح پر ہزارہا نرالی کتابیں دستیاب ہو چکی ہیں جن کی ہستی کا میکس مولر کے زمانہ میں گمان بھی نہ تھا۔ برسوں کی تلاش و تحقیقات سے یہ ظاہر ہے کہ ملک میں لاکھوں قلمی کتابیں مختلف کتب خانوں میں بحفاظت رکھی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ کے شعبۂ سنسکرت میں چھ ہزار تین سو قلمی کتابیں موجود ہیں۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کی سنسکرت لائبریری میں چھ ہزار چار سو نسخے ہیں۔ کوئن کالج بنارس کا کتب خانہ دنیا میں سب سے بڑا ہے جہاں پینتالیس ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں، اور یہ ہندوؤں کے مشہور مقدس شہر کے شایانِ شان ہے کہ وہاں پر ادبیات سنسکرت کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ سارے ملک کے طلبا وہاں پر علمی پیاس بجھانے کو جاتے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں ہر قسم کے علوم کی سنسکرت کی قلمی پرانی کتابوں کی تعداد پچیس ہزار ہے۔ سنسکرت سہائتہ پری شد کلکتہ میں پانچ ہزار نسخے ہیں۔ بریندر ریسرچ سوسائٹی راجشاہی کے کتب خانے میں بھی پانچ ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں۔ اورنٹیل لائبریری مدراس کے شعبۂ سنسکرت میں تیس ہزار پرانی کتابیں ہیں۔ تنجور کے شاہی کتب خانے میں بارہ ہزار، ترلوندم کے شاہی کتب خانے میں دس ہزار، میسور کے شاہی کتب خانہ میں سولہ ہزار، بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ پونا کے کتب خانے میں تیئس ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ آنند آشرم پونا کے کتب خانے میں آٹھ ہزار، یونیورسٹی لائبریری بمبئی کے شعبۂ سنسکرت میں دو ہزار، ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی کے کتب خانہ میں آٹھ ہزار، کتب خانہ دربار بڑودہ میں سولہ ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں دربار لائبریری بیکانیر میں پانچ ہزار، الور میں چھ ہزار، اور دربار لائبریری جموں میں بارہ ہزار قدیم قلمی کتب ہیں۔ اس کے سوا جے پور، اودے پور جودھ پور اور دیگر ریاستوں کے سرکاری کتب خانوں میں بھی ہزارہا پرانی قلمی کتابیں موجود ہیں۔ جن کی فہرستیں تیار نہیں کی گئی ہیں۔ مگر مذکورہ صدر کتب خانوں کی کتابوں کا شمار بھی ڈھائی لاکھ کے قریب ہے دربار نیپال کے کتب خانے میں ہزارہا پرانی کتابیں بھوج پتر، چرم اور تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں وزیر اعظم نیپال نے پانچ ہزار جلدیں آکسفورڈ یونیورسٹی کی نذر کی تھیں۔ علم دوست رؤسا اور امرا نیز پنڈتوں کے پاس ہزارہا پرانی قلمی کتابیں مختلف علوم و فنون پر موجود ہیں جو ہمارے شمار

سے خارج ہیں۔ اگر ملک ہند میں سنسکرت کی قلمی کتابوں کا شمار پانچ سات لاکھ کے درمیان سمجھا جائے تو راستی سے بعید نہ ہوگا۔

اب یورپ کے کتب خانوں کی کیفیت ملاحظہ ہو، مشہور عالم سنسکرت کول بروک نے بڑی کوشش اور تندہی سے ایک لاکھ روپیہ خرچ کرکے شاندار کتب خانہ مہیا کیا تھا جسے وہ پنشن لینے کے بعد ولایت لے گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا۔ اس ذخیرہ میں بہت نایاب اور قابل قدر کتابیں تھیں جواب وزیر ہند کے کتب خانہ کے شعبۂ سنسکرت میں شامل ہیں اب ان کا شمار بیس ہزار ہے۔ عجائب خانہ برطانیہ کے شعبۂ سنسکرت میں چار ہزار اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اٹھارہ ہزار قلمی نسخے ہیں کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں پانچ ہزار پرانی نایاب کتابیں سنسکرت کی موجود ہیں۔ پیرس کا کتب خانہ بہت شاندار ہے جس کے شعبۂ سنسکرت میں دس ہزار نسخے موجود ہیں۔ مگر یورپ میں پرانی سنسکرت کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ برلن (پایۂ تخت جرمنی) میں ہے جہاں تیس ہزار قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان میں بہت سی دستی کتابیں ایسی ہیں جو آج کل کلیتہً نایاب ہوگئی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ جرمنی کے ارباب تحقیقات علوم ہند سے کتنی دلچسپی لیتے ہیں اور تحقیقات علمی میں کس قدر دماغ سوزی سے کام لیتے ہیں۔ میونک اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں دو دو ہزار پرانی قلمی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ پایۂ تخت روس کے سرکاری کتب خانے کے شعبۂ شرقیہ میں دس ہزار نسخے سنسکرت کے موجود ہیں۔ وائنا صدر آسٹریا کے کتب خانے میں چار ہزار قلمی کتابیں بیان کی جاتی ہیں۔ اٹلی۔ ہالینڈ۔ بلجیم کی تعلیم گاہوں کے کتب خانوں میں بھی بہت سی سنسکرت کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں لیکن جن بڑے بڑے کتب خانوں کا اوپر ذکر آیا ہے اُن کے ذخائر سنسکرت کی فہرستیں مرتب ہوچکی ہیں جن کا مجموعی شمار ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک ہند اور یورپ کے کتب خانوں میں ساڑھے تین لاکھ قلمی کتابیں موجود ہیں۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں جو ہزارہا سنسکرت کی کتابیں پائی جاتی ہیں اُن کا کوئی حساب نہیں ہے اور نہ دنیا کی اور یونیورسٹیوں کے ذخائر سنسکرت کا کوئی مناسب تخمینہ مرتب کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ملک ہند، ایشیا، یورپ، امریکہ اور دیگر ملکوں کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں ہر قسم کی قلمی سنسکرت کی کتابیں آٹھ لاکھ کے قریب ہونگی۔ اور یہ بات دعوے کے ساتھ بیان کی جاسکتی ہے کہ زبان سنسکرت کی ہمہ گیری جیسا کہ اس کے ان گنت قلمی نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے اپنی نظیر آپ ہے۔ دنیا کی کوئی پرانی زبان

---

[۵] قلمی کتابوں کے مندرجہ بالا اعداد و شمار کے لئے راقم مضمون پروفیسر بھگوت دت صاحب ایم۔ اے پروفیسر ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کا مرہون منت ہے۔

اس لحاظ سے سنسکرت کی برابری کا دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔

سنسکرت کے احسانات علوم جدیدہ پر

اس کے علاوہ علوم جدیدہ پر بھی سنسکرت کے بیحد احسانات ہیں، اس کا ثبوت بھی مشہور ماہرانِ مغرب کے اقوال ذیل سے ملے گا جو اس انقلاب عظیم کو خوشی تسلیم کرتے ہیں جو مغرب میں علوم سنسکرت کی اشاعت کے طفیل میں رونما ہوا ہے۔

تاریخ تمدن کے دور جدید کا آغاز علوم ہند کے انکشاف سے ہوتا ہے جس سے ارباب تحقیق کے تمام مسلّمہ تصورات تہ و بالا ہوگئے ہیں اور کئی نئے علوم کی بنیاد پڑی ہے۔ اضلاع متحدہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر ایم۔ بلوم فیلڈ اس انقلاب عظیم کی نسبت جو سنسکرت کے طفیل میں اقلیم سائنس میں واقع ہوا ہے۔ یوں لکھتے ہیں "جب سے یونانی اور لاطینی زبان اور اُن کی ادبیات کا مطالعہ اور تحقیقات شروع ہوئی ہے تاریخ تمدن میں ایک بھی ایسا معرکۃ الآرا واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔ جیسا اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں علوم سنسکرت کا انکشاف ہے۔ لسانیات اور تاریخ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر علوم سنسکرت کا انقلاب خیز اثر نہ پڑا ہو۔ علوم ہند قدیم کے مطالعہ اور تحقیقات سے ہندیورپی تاریخ کے ابتدائی زمانہ پر بہت گہری روشنی پڑی ہے السنۂ اضافی کا نظریہ اسی کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے۔ اسانیات وسمیات نسبتی، مذاہب، صنائی قانون، مختلف شعبہ جات تاریخ و فلسفہ یا تو اسی سے برآمد ہوئے ہیں یا اس کی تحقیقات کے قابل قدر نتائج سے ان کی قلب ماہیت ہوئی ہے۔ اور ان پر مستقل اثر رونما ہوا ہے۔"[۵۱] برطانیہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر رالیسن کا قول بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ارباب تحقیق نے زبان سنسکرت کو لاطینی۔ یونانی فارسی اور دیگر یورپی زبانوں کا مبدء قرار دیا تھا۔۔۔۔ اس کی بدولت ہندیورپی قوموں کی جو چینی ترکستان سے آئرلینڈ تک آباد ہیں۔ تاریخ تمدن کے ابتدائی زمانہ پر معتدبہ روشنی پڑتی ہے، کیونکہ مشابہت زبان اور معاشیات اور معتقدات کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے ۔۔۔ سنسکرت کے مطالعہ سے انسان کی زبان کا تصور کہنہ قطعاً بدل گیا ہے۔ علوم ہند قدیم کے مطالعہ سے پرانے زمانہ کے تمدنی حالات منکشف ہوتے ہیں۔ ان کا اثر اہل مغرب کی عقلی زندگی اور ان کے ذہنی مشاغل پر بھی بہت گہرا پڑا ہے" مغرب کے یہی دو ماہر ایسے نہیں ہیں جو سنسکرت کے مطالعہ کے معرکۃ الآرا نتائج کے قائل ہیں بلکہ مشہور پروفیسر اے۔ اے۔ میکڈانل جن کا پچھلے دنوں انتقال ہوچکا ہے اس کے معترف ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "احیاء العلوم کے بعد تاریخ تمدن میں ایسا کوئی واقعہ عالمگیر اہمیت کا واقع نہیں ہوا جیسا کہ علوم سنسکرت کا انکشاف ہے

[۵۱] "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد سوم صفحہ ۱
[۵۲] ملاحظہ ہو "انشنٹ انڈیا" صفحہ ۵-۶ مطبوعہ ۱۹۱۵ء

السنہ، مذاہب، عقلی مشاغل کے کوائف اور پرواز فکر کے کارنامے اسی زبان کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ ہندوؤں کا سارا تمدن اسی میں مقید ہے ..... علم سنسکرت سے السنۂ اضافی کی اور ویدوں کی زبان سے ضمیات نسبتی کی بنیاد پڑی ہے۔ گو اس انقلاب اہم کا اثر علوم کے تمام شعبوں میں رونما ہو رہا ہے۔ مگر سب سے بڑی تبدیلی فلسفہ اور مذاہب[1] میں نمایاں ہوئی ہے۔" ڈاکٹر ونیٹرنیٹس ایک بلند مرتبہ مستشرق ہیں آپ پراگ یونیورسٹی (بوہیمیا) کے مشہور استاد سنسکرت ہیں۔ آپ کی رائے یہ ہے: "ملک ہند کے قدیم ادبیات کے مطالعہ سے پرانی اور نئی زبانوں کی مناسبت باہمی واضح ہوئی، جس سے تاریخ تمدن کے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے وسیلہ سے قوموں کے مقدم التاریخ تعلقات[2] بخوبی ظاہر ہوتے ہیں۔" ان مشاہیر استادوں نے سنسکرت اور علوم جدیدہ پر عرصہ کی جامع و مانع تحقیقات کے بعد اپنی مسلمہ رائے کا اظہار کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت لٹریچر کے مغرب میں مشتہر ہونے سے اقلیم سائنس میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوا ہے۔ السنۂ اضافی و مذاہب نسبتی ضمیات اور دیگر علوم کی ترقی و توسیع کو سنسکرت سے بہت مدد ملی ہے۔ یہاں پروفیسر اے۔ اے میکڈانل کی ایک اور رائے پیش کرنا ضروری ہے جس سے سنسکرت کا احسان جو اس نے تاریخ آدم پر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے۔ عالی دماغ اور مستقل مزاج ماہران علوم سنسکرت کی دماغ سوزیوں اور عرق ریزیوں سے ہندو تمدنی کمالات کی ۳ ہزار سالکی صحیح اور معتبر تاریخ برآمد ہو کر مرتب ہو گئی ہے۔ السنہ۔ مذاہب۔ ادبیات۔ علوم و فنون اور اسلاف ہند کے صدہا سال کے معاشرتی حالات اور رسم و رواج کا مسلسل احوال صحت و درستی سے قلم بند کئے جانے کا مواد بہم پہونچ گیا ہے۔ ادبیات سنسکرت کی چھان بین سے تاریخ ہند قدیم پر بھی بہت مفید اثر پڑا ہی اس کے اوراق پریشاں کی صحیح ترتیب کا بہت کارآمد مسالہ بہم پہونچ گیا ہے۔ اب سے چوتھائی صدی پہلے جو تاریخ نصاب میں شامل تھی اس کا سب سے پرانا اور معتبر واقعہ سکندر اعظم کا حملۂ پنجاب تھا۔ جو ۳۲۶ ق م کا واقعہ ہے۔ مگر پچھلے تیس چالیس سال کے عرصہ میں جو تحقیقات ادبیات سنسکرت اور پالی زبان کی کتابوں کی ہوتی چلی آئی ہے۔ اس سے یہ بیش قیمت نتیجہ مرتب ہوا ہے کہ "معتبر تاریخ ہند کا زمانہ" ماہران تاریخ ہند نے اتفاق رائے سے سن عیسوی سے چھ سو برس پہلے قرار دیا ہے۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" جلد اول (ہند قدیم) مطبوعہ ۱۹۲۲ء میں ممتاز مستشرقین نے ہند قدیم کے متعلق متفرق مضامین شائع کئے ہیں جن کی معلومات کلیۃً سنسکرت ادبیات۔ پالی کتب اور کتبہ جات و سکہ جات

---

[1] ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر ص ۵-۶ مطبوعہ ۱۹۱۷ء

[2] ہسٹری آف انڈین لٹریچر جلد اول ص ۱ مطبوعہ ۱۹۲۶ء

کہنہ سے ماخوذ ہیں۔ جن سے تحقیقات جدیدہ کی جامعیت اور قدر و قیمت بخوبی آشکار ہے۔ پروفیسر بی۔ اے۔ کیتھ (ایڈنبرا) نے نظام تمدن پر جس میں ذات پات کی ابتدا اور جمہور کے مشاغل، معاشرت اور فلسفہ کی ابتدا اور علاقہ وسطیٰ (مدھ دیش) میں آریہ تمدن کی اشاعت پر تازہ اور نرالے معلومات کی وسعت کے ساتھ بحث کی ہے۔ پروفیسر کارنیٹر (آپسالہ یونیورسٹی ناروے) نے جین مت پر، اور پروفیسر ریس ڈیوڈسن نے بدھ مت کی تاریخ اور ملکی حالات، اور مہاتما بدھ کے زمانہ کے اقتصادی حالات اور چندر گپت اعظم کے عہد حکومت کے کوائف قلمبند کئے ہیں۔ امریکہ کے ماہر سنسکرت پروفیسر ای ڈبلو۔ ہاپ کینس نے رزمیہ نظموں اور سوتروں سے تمدنی اور پولیٹیکل حالات اور راعی و رعایا کے تعلقات اور معاشرت پر قابل قدر روشنی ڈالی ہے۔ اسی قسم کے اور سودمند مضامین بھی اس قیمتی کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں جین مت اور بدھ مت کے بانیوں کا زمانہ نہایت معتبر تسلیم کیا گیا ہے۔

مغربی استادوں ہی پر کیا موقوف ہے، ملک ہند کے نوعمر ارباب تحقیق جنھوں نے مغربی استادوں سے اور نیز مغربی تعلیم گاہوں میں نئی تعلیم پائی ہے سنسکرت لٹریچر کی چھان بین بطور خود کر رہے ہیں انھوں نے ان ہندو حکمرانوں کے حالات مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جن کی روایات مہابھارت اور پرانوں میں پائی جاتی ہیں۔ جین مت کے بانی سے پہلے جو جو کشتری اقوام مختلف صوبوں میں حکمران تھیں ان کے حالات بڑی دماغ سوزی اور تحقیقات سے مرتب کئے ہیں۔ اقتصادیات ہند قدیم فن حکومت اور دیگر مسائل پر معرکۃ الآرا کتابیں تالیف و شائع کی گئی ہیں۔ پروفیسر ابناش چندر داس نے اپنی جامع تحقیقات کا مضمون سب سے نرالا مقرر کیا ہے۔ جو ویدک شائستگی کی ابتدا سے تعلق رکھتا ہے آپ نے دو معرکۃ الآرا کتابیں شائع کرکے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ ماہر موصوف کی جامع تحقیقات سے بنی آدم کی تاریخ سلف کے اوراق منتشر مرتب کرنے کا قابل قدر مواد بہم پہونچ گیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے محقق اس مبارک کام میں اور صوبوں کے ماہروں سے نسبتاً بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ قصہ کوتاہ سنسکرت کے انکشاف سے نہ صرف تاریخ ہند قدیم کے ابتدائی دور ہی کے معلومات مہیا ہو گئے ہیں بلکہ بنی نوع انسان کی تاریخ قدیم بعید کے اوراق گم شدہ بھی دستیاب ہو گئے ہیں جو بجائے خود ایک نہایت شاندار کارنامہ ہے۔ جو انکشاف سنسکرت کی بدولت مرتب ہوا ہے، اگر زبان سنسکرت

ا؎ "رگ ویدک انڈیا" جلد اول مطبوعہ ۱۹۲۱ء اور "رگ ویدک کلچر" مطبوعہ ۱۹۲۵ء جس میں آپ کے بلند تخیلات پڑھنے چاہئیں۔ (ج۔ د۔ ر)

کی بہت پرانی کتابوں کا علم حاصل نہ ہوتا۔ تو بنی آدم کی تاریخ تمدن کا دورِ اولین قابل قدر اور معتبر معلومات
سے سراسر ناآشنا رہتا۔ اور یہ کوتاہی کسی اور وسیلہ سے پوری نہ ہو سکتی تھی، اور انسان کی ترقی تمدن
کے نہایت پرانے اور معتبر حالات ہم نہ پہونچ سکتے تھے۔ مشہور ماہر سنسکرت میکس مولر کا یہ قول ہے کہ
"وید بنی آدم کے کتب خانے میں سب سے پرانی کتابیں ہیں"۔ اسی وجہ سے ان کی قدر و قیمت کا
کما حقہ اندازہ ناممکن ہے۔[۱]

اسلاف ہند کی شائستگی

سنسکرت میں جن علوم و فنون کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہ زمانۂ حال کے ماہران
علم تمدن کے نزدیک کیا حیثیت رکھتے ہیں، یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ جس کا جواب ماہران زمانۂ حال
ہی کی زبان سے مناسب ہوگا:۔

ماہران و ارباب فکر میں بی. کڈ نے اپنی زندگی تمدن کے ارتقا اس کے معانی اور لوازمہ کی تشریح
کے واسطے مخصوص کر رکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "تمدن کا اطلاق علوم و فنون، طرز حکومت، نظام معاشرت اور
باہم گر مشارکت عمل پر ہوتا ہے۔ شائستگی (culture) اور تعلیم بھی اسی کی ذیل میں شمار ہوتی
ہے، اس سے وہ لوازم اور خصوصیات مراد ہوتے ہیں جن کے باعث ہم وحشیوں سے برتر اور ممتاز
شمار ہوتے ہیں"۔ پروفیسر جے۔ ایس۔ میکنزی علم تمدن کے مشہور ماہر کی رائے بھی قابل غور ہے:۔
"جب انسان ان اغراض سے تحریک پذیر ہوتا ہے جو انانیت اور شائستگی کے متبائن ہوتے ہیں۔
تو ایثار علی النفس کی اہلیت ظہور میں آتی ہے، اور یہ تعلیم کے مترادف ہے جس کے جامع ترین معنی فطرت
انسانی کی تکمیل اور پاکیزگی ہے۔۔۔۔ ادبیات میں سائنس اور صناعیوں (آرٹ) کے اغراض انتہائی
شامل ہیں۔ فن شاعری، مذہب اور شائستگی کا سرتاج فلسفہ ہے۔ جس کا مقصود اولی عالم کے نشیب و فراز
پر جامع و مانع نگاہ ڈالنا ہے۔ اس کے طفیل میں شاعری اور مذہب کے اعلیٰ ترین تخیلات میں ربط پیدا
ہوتا ہے"۔ پروفیسر میکنزی کے خیال میں ادبیات کے اعلیٰ ترین مقاصد میں سائنس، صناعیاں، مذہب
اور فلسفہ کے ادق ترین خیالات شامل ہیں۔ شاعری اور مذہب بغیر فلسفہ کے بے جان ہے۔ اب ایک
تیسرے نامی ماہر ڈاکٹر جے۔ بی۔ کروزر کا قول ناطق ہے "عقل ارادت سے، ارادت تصور سے اور
تصور خواہشات اور جذبات سے منسلک اور مربوط ہے۔۔۔۔ تمدن مذہب اور فن حکومت پر حاوی ہے
سائنس اس کا جزو لاینفک ہے۔ اور ان تینوں کا جو نیک اور سود مند اثر معاشرت پر پڑتا ہے۔ وہ بھی

---

۵۱ ماخوذ از "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد سوم صفحہ ۲۰۶
۵۲ "آوٹ لائن آف سوشیل فلاسفی" صفحہ ۲۲۲ سے ۲۲۵ تک مطبوعہ ۱۹۱۸ء (ج۔ ر۔ ۔)

تمدن ہی کے ذیل میں شمار ہوتا ہے۔ . . . . مذہب کے وسیلہ سے اخلاقی، نفسیاتی اور عقلی زندگی میں موافقت اور موانست پیدا ہوتی ہے، جو اس کے اظہار استمراری کے واسطے لابدی ہے۔ مذہب کی بدولت اضطراب قلبی اور ہیجان باطنی رفع ہوتا ہے۔ اس سے کائنات کی علت حقیقی کی تحقیقات میں ہدایت اور تحریک نصیب ہوتی ہے۔ . . . اس کے وسیلہ سے روح[1] پاکیزگی اور خدا ترسی کی بہترین زندگی بسر کرنے کی قوت اور صلاحیت حاصل کرتی ہے۔" اور بڑے بڑے ماہروں کے آراء کے اقتباسات بھی پیش ہو سکتے ہیں، مگر ہمارے موجودہ مقصد کے واسطے اسی قدر کافی ہیں۔ اگر مغرب کے مشہور ارباب فکر اور ماہران علم تمدن کے مسلمہ معیار کے رو سے ادبیات سنسکرت پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اہل سنسکرت کے علمی کارنامے جو ایسے زمانہ میں انجام پذیر ہوئے تھے جب زمانۂ حال کی متمدن قوموں کے اجداد لوازم شائستگی سے محروم اور ضروریات تمدن سے بیگانہ تھے تو ان کارنمایاں کے واسطے سوائے تحسین و آفریں کے اور کیا زبان سے نکل سکتا ہے! مغرب کے مشہور ماہران سوشیالوجی (معاشیات) اور استادان انتھراپالوجی (السانیات) کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مذہب ہر قسم کی ترقیوں کا محرک اعظم ثابت ہوا ہے۔ پرانے زمانہ کے آریہ ہندوؤں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذہب ایجاد کیا تھا جو رگ وید میں مذکور ہے۔ فلسفیانہ تخیلات بھی اسی پرانی اور مقدس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ نہ صرف یہی ان کا بہترین کارنامہ ہے بلکہ انھوں نے دنیا کی نہایت کامل شستہ اور جامع زبان بھی اختراع کی جو ان کے بیش بہا خیالات کی حامل تھی۔ انھوں نے ان خیالات کو پاکیزگی کے ساتھ بپردۂ شعر میں ظاہر کیا۔ گویا بہترین زبان کے ساتھ فن شاعری کے بھی وہی موجد ہوئے۔ ویدوں کی رچاؤں کے پڑھنے کے قواعد بھی بنائے۔ ویاکرن (صرف و نحو) کا کمال سب سے نرالا ہے۔ پانینی سے بڑھکر عالی دماغ کوئی موجد گرامر دنیا میں نہیں گذرا، اگر سنسکرت کے دنیوی علوم و فنون کے لٹریچر پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسلاف ہند قدیم کی ہمہ گیر قابلیت سے کوئی بات اور کوئی مسئلہ باقی نہ رہا۔ وہ ریاضیات اور فلکیات کے تمام شعبہ جات پر حاوی تھے، طب اور خواص الادویہ (جس میں جانوروں کے امراض و علاج کا طریقہ بھی شامل ہے) اور فن دواسازی، فن شاعری کے تمام نمونے اور ہر قسم کے ڈرامے اور قصے موجود ہیں۔ ادبیات پر خواہ کتنی ہی جامع و مانع نگاہ ڈالیے سنسکرت لٹریچر ہر ایک کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ زمانۂ قدیم بعید کے ہندوؤں نے لوازم تمدن ایجاد کئے ان کی اشاعت میں سرگرمی دکھائی، ہندوستان کے باہر لنکا، جزائر جاوا و سماٹرا، ملایا، سیام، ہند چینی

[1] ماخوذ از "سیولزیشن اینڈ پروگریس" مقدمہ ص ۱۰ و نیز ص ۲۶ و ۲۶۳

چین۔ تبت، ترکستان وغیرہ ملکوں میں ہندو تمدن کا اثر اب تک نمایاں ہے۔ اکثر ممتاز ماہروں کا یہ خیال ہے کہ ایران بابل، ایشیائے کوچک، یونان کا تمدن پرانے ہندو آریہ تمدن سے مستعار ہے۔ اس لحاظ سے اہل سنسکرت علم برداران تمدن کہلانے کے ہر طرح مستحق ہیں۔ ہندو آریہ بزرگوں کا سب سے بڑا کمال تمدنی ویدک شائستگی اور سنسکرت کا عجیب و غریب لٹریچر ہے۔ جس کی بدولت علوم جدیدہ کی کایا پلٹ گئی ہے۔

درآمد شراب

ہندوستان میں غیر ملکوں سے جو شراب آتی ہے اُس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے:۔

سنہ ۱۸۶۱ء	ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۸۷۱ء	دو کروڑ پچاس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۸۸۱ء	پانچ کروڑ پچاس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۰۵ء	آٹھ کروڑ دس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۱۳ء	بارہ کروڑ پچہتر لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۲۰ء	اٹھارہ کروڑ بائیس لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۲۸ء	اکیس کروڑ روپیہ

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے واضح ہے کہ سنہ ۱۸۶۱ء سے سنہ ۱۹۲۸ء تک درآمد شراب میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد کے اعداد موجود نہیں ہیں مگر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شراب کے استعمال کے خلاف ملک میں جو عام نفرت پیدا ہوگئی ہے اس کے اثر سے یقیناً کچھ نہ کچھ کمی ہوئی ہوگی۔ ہمارے خیال میں ہر محب وطن ہندوستانی کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ نہ صرف غیر ملکی شراب بلکہ ہندوستانی شراب کے استعمال سے بھی پرہیز کرے اور دوسروں کو اس کے خراب نتائج سمجھا کر اس کے استعمال سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہندوستان کا بہت روپیہ بچ جائے۔ (ماخوذ)

سیتاجی

(از مسٹر عبدالباقی جیراج پوری)

موجودہ زمانہ میں جبکہ یورپ کی کورانہ تقلید مشرقی تہذیب کے خط و خال تو مسخ کر رہی ہے اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ جامع الصفات مشرقی خواتین کی مبسوط سوانح عمریاں اس طریقہ پر لکھی جائیں جن کو پڑھکر مشرقی کیرکٹر کے وہ نقوش جو مشرق و مغرب کے ارتباط کی وجہ سے ہمارے دل و دماغ سے محو ہو رہے ہیں پھر اُبھر آئیں۔ لیکن ارباب نظر ان جلیل القدر ہستیوں سے عام طور پر عدم التفاتی و بے اعتنائی برتتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے یہاں باوجود مختلف علوم و فنون کے فروغ کے فن سیرت نگاری بالکل ناتمکمل حالت میں ہے خصوصاً خواتین کے حالات بہت ہی کم لکھے گئے ہیں۔

کسی خاتون کے سوانح حیات مرتب کرنے میں سب سے زیادہ نازک مقام وہ آتا ہے جہاں سیرت نگار اس کے چال چلن، عادات و خصائل کا ذکر کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عورت کو بلحاظ حسن و جمال خواہ کتنا ہی عروج کیوں نہ حاصل ہو لیکن اگر وہ صفات حسنہ سے معرا ہے تو وہ اس پھول کے مثال ہے جس میں رنگ و بو نہ ہو، یا وہ ایسا نغمہ ہے جس میں کوئی الحان و ترنم نہ ہو۔ مکمل عورت ہونے کے لئے بہت سی باتیں ضروری ہیں۔ مثلاً شرم و حیا، عفت و عصمت، مہر و وفا، عجز و فروتنی، اخلاص و ایثار، ضبط نفس و خودداری، ادب و اخلاق۔ اگر عورت ان صفات سے متصف ہے تو اس کے مکمل عورت ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اب ان خصوصیات کے لحاظ سے ہم سیتاجی کی سوانحعمری پر نظر ڈالتے ہیں۔

سیتاجی کی پرورش فطرت نے ایک ایسے خاندان کے سپرد کی جس کا ستارۂ اقبال نہایت آب و تاب کے ساتھ افق ہند پر چمک رہا تھا یعنی اس نیک نہاد شہزادی نے راجہ جنک کے گھر میں جنم لیا۔ جن کے سطوت و جبروت کا شہرہ اُس وقت سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ مستقبل میں یہ اپنے خداداد حسن صورت و سیرت کی بدولت مشہور آفاق ہوگی اور اس کی سیرت دنیا بھر کی عورتوں کے لئے سبق آموز بنے گی۔

فطرت کی بے شمار فیاضیوں میں سب سے بیش بہا عطیہ یہ ہے کہ وہ جس ذات کو فروغ دینا چاہتی ہے

اس کو ایسے ماحول کے سپرد کردیتی ہے۔ جہاں اخلاقی و ذہنی ترقی کے سب سامان اس کے سنوارنے میں مصروف کار رہتے ہیں۔ انھیں حدود میں دماغی و ذہنی تعمیر کی وہ داغ بیل پڑتی ہے جسے ہم تربیت سے تعبیر کرتے ہیں اور جو اپنے دورِ مستقبل میں گوناگوں اثرات و کیفیات کے ماتحت نشوونما پاتی رہتی ہے۔

اس ابتدائی منزل کے وہ دو چار نقوش جن کو بچہ اپنی دماغی بضاعت وصلاحیت کے مطابق قبول کرلیتا ہے، عمر کے آخری حصہ تک اس کے دماغ سے زائل نہیں ہوتے۔ فہم و ذکا، زہد و اتقا، تحمل و برداشت حلم و بردباری، عاجزی و انکساری، وفاشعاری و مروت، متانت و سنجیدگی جن کو سیتاجی فطرت کی طرف سے لیکر آئی تھیں گردوپیش کے تناسب و توازن نے ان میں چار چاند لگادیے۔ "فطرت" انسان کو جو کچھ سکھاتی پڑھاتی ہے وہ قید و بند کے مصنوعی درس و تعلیم کی دسترس سے باہر ہوتا ہے، تعلیم و تربیت دراصل ایک ہی سلسلہ کی دو مختلف کڑیاں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ چاند ہے یہ ہالہ، وہ بوٹا ہے یہ پھول، اگر کسی کی تربیت ناقص ہے تو تعلیم اس کی اصلاح کرتی ہے۔ سیتاجی جن کا دامنِ تربیت ان بیش بہا موتیوں سے بھرا ہوا تھا جب حلقۂ درس و تدریس میں داخل ہوئیں تو ان کے فطری جوہر اور بھی چمک اُٹھے ایک قدیم مسلمان مورخ (قادر) جس کو نسوانی کیریکٹر کی تنقید سے خاص ذوق ہے سیتاجی کے بارے میں لکھتا ہے کہ "سیتا کی ولادت راجہ جنک کے گھر میں گویا طلوعِ آفتاب کی وہ پہلی کرن تھی جس کے خیر مقدم کے لئے دنیا بہت پہلے سے چشم براہ رہتی ہے، اور جس کی آمد ظلمت کو نور میں اور تاریکی کو روشنی میں تبدیل کرکے سارے عالم پر اپنے جاہ و جلال کا سکہ جما دیتی ہے۔" یہی مورخ آگے چلکر لکھتا ہے کہ:-

"سیتاجی اوائل عمر ہی سے غور و فکر اور تدبر و تامل کی عادی تھیں۔ بیکسوں کی غمخواری کرنا، غریبوں پر ترس کھانا، ناداروں کی دلجوئی کرنا ان کا روزمرہ کا دستور ہوگیا تھا۔ عام لڑکیوں کی طرح معمولی لہو و لعب سے ان کو نفرت تھی۔ راجہ جنک بھی جو حد درجہ جوہر شناس، ہنرپرور اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے اپنی بیٹی کو بیٹوں سے بھی بڑھکر سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے ارکینِ سلطنت اور مدبرانِ مملکت کے مشورہ سے سیتاجی کے لئے ایسے قابل اتالیق مقرر کئے جو صبح و شام ان کی فطرت کے مطابق درس دیتے تھے چنانچہ سنِ شعور سے بہت پہلے اُنھوں نے وہ بات حاصل کرلی جس کو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے۔ ابھی رسم سوئمبر کی ادائیگی کے دن بہت دُور تھے کہ ان کے کمال اور استعداد کا چرچا تمام شمالی ہند میں پھیل گیا۔

سنِ شعور کو پہونچنے کے بعد عورت ایک ایسی اجنبی دنیا میں قدم رکھتی ہے جہاں اس کے ہر فعل و عمل، نقل و حرکت کا گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود اپنے حسیات میں ایک ہیجان محسوس کرتی ہے۔

وہ صبح سے شام تک اس خیال میں محو رہتی ہے کہ وہ کیا سے کیا ہوتی جارہی ہے۔ اس نازک، پرآشوب اور کشمکش کے دور میں پاکیزہ تربیت اور اعلیٰ تعلیم ہی عورت کے لئے مشعلِ ہدایت بن جاتی ہے۔ سیتاجی چونکہ تعلیم و تربیت دونوں کے فیوض سے کامل طور پر بہرہ اندوز ہو چکی تھیں اس لئے ان میں اس کیریکٹر کے مستحکم اور پائدار بنانے کی پوری صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جس سیرت کے ساتھ فطرت نے سیتاجی کو وہ حسن و جمال بدرجۂ اتم بخشا تھا ان کا رفیق زندگی دنیا کا وہ عظیم القدر انسان ہوا جو شر و فساد، فسق و فجور کی بیخکنی اور صداقت و راست بازی کا پیغام سنانے کے لئے دنیا میں آیا تھا۔ رام چندرجی کی بدولت سیتا جی کی زندگی بالکل مکمل ہو گئی۔ سیتاجی کی ازدواجی زندگی اُن کے گزشتہ دور سے کہیں زیادہ درخشاں اور شاندار ہے۔ سری رام چندرجی کے بن باس کے زمانہ میں اس نیک سرشت خاتون نے جس صبر و استقلال کا ثبوت دیا ہے اس سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت اہم سے اہم مراحل زندگی میں مرد کے دوش بدوش چلنے کی قدرت رکھتی ہے

سری رام چندرجی کی جلاوطنی اور سیتاجی کی وفاشعاری کا واقعہ یہ مورخ (قادر) اس طرح لکھتا ہے کہ "جب رام چندرجی کی تاج پوشی کا وقت آیا تو سارے اجودھیا میں چہل پہل تھی اور شہر کا گوشہ گوشہ دُلہن بنا ہوا تھا، لیکن دوسرے ہی دن یہ خوشی غم سے بدل گئی"، اور رام چندرجی کو اپنے محترم باپ کے حکم کی تعمیل میں ترکِ وطن کرنا پڑا، اس کشمکش اور ابتلاء کے وقت سیتاجی نے جس وفاشعاری اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا وہ تاریخ ہند کا ایک روشن واقعہ ہے۔ تمام اعزا کی منت و سماجت کے باوجود سیتاجی رام چندرجی کے ساتھ جنگل کی تکالیف برداشت کرنے سے باز نہ آئیں، اور جس طرح موج آغوش آب سے جدا نہیں ہو سکتی اسی طرح یہ وفاپرست اور راست باز بیوی اپنے پتی کو نہیں چھوڑ سکی۔ خود رام چندرجی نے بھی بہت سمجھایا کہ طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا ہوگا جو حدِ برداشت سے باہر ہونگی لیکن سیتاجی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ "ان سارے مصائب و آلام، درد و غم کا طوفان صرف آپ کی ایک نگاہِ لطف سے دُور ہو جائے گا"

تاریخ کی یہ ایک مہتم بالشان حقیقت ہے کہ جو بات عوام میں مشہور ہو جاتی ہے اس کی تحقیق کرنے کی بہت کم لوگ زحمت اُٹھاتے ہیں۔ ایک نے دوسرے سے سنا، دوسرے کو تیسرے سے معلوم ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں وہ بات صحیفۂ آسمانی کے بمنزلہ سمجھی جانے لگی۔ حالانکہ ذراسی کاوش کے بعد اصل واقعہ کا پتہ بہ آسانی چلایا جا سکتا ہے لیکن یہ زحمت کون برداشت کرتا ہے۔ سیتاجی کا وہ منظر زندگی بھی جب راجہ لنکا فریب دیکر ان کو اُٹھالے جاتا ہے اسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔ اصل ماجرا

صرف اس قدر ہے کہ جب رام چندرجی دلفریب آہو کے پیچھے سراپا آرزو بنکر ہو لیتے ہیں تو تھوڑی ہی دور جاکر نالہ و فریاد کی صدا سے فضائے صحرا گونج اُٹھتی ہے۔ سیتاجی جو لچھمن جی کی زیرنگرانی کٹی میں بیٹھی ہوئی تھیں یہ آواز سنکر فرطِ محبت سے بے قرار ہو جاتی ہیں کہ شاید رام چندجی پر کوئی آفت نہ آئی ہو۔ اور لکشمن جی سے تحقیق حال کے لئے جانے کو کہتی ہیں۔ لکشمن جی ان کو تنہا چھوڑکر جانے سے انکار کرتے ہیں مگر بالآخر سیتاجی کے اصرار سے مجبور ہوکر ان کو جانا پڑتا ہے۔ جس کے بعد سفاک راجہ راون فقیر کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے، سیتاجی اس کو بھیک دینے جاتی ہیں وہ زبردستی ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس حال میں کہ وہ روتی جاتی ہیں اور اپنے زیورات نشان دہی کی غرض سے پھینکتی جاتی ہیں۔ وہ انھیں لنکا لے جاتا ہے اور کچھ مدت کے بعد رام چندرجی اس سے جنگ کرکے سیتاجی کو پھر پا لیتے ہیں۔"

جنگِ لنکا کے سلسلہ میں یہی مورخ لکھتا ہے کہ "جب رام چندرجی لچھمن جی کے ساتھ واپس آئے تو سیتاجی کو وہاں نہ دیکھکر سخت مضطرب و پریشان ہوئے، اِدھر اُدھر تفتیش کی، کہیں پتہ نہ چلا۔ شدہ شدہ ہنومان جی سے جو انھیں کی طرح جلاوطن تھے تعارف ہوا، ہنومان جی نے رام چندرجی کی بڑی دلدہی کی اور فوراً دو بلند مرتبہ سپاہیوں سگریو اور بلی کو تحقیق حال کے لئے بھیجا بعد کو خود بھی گئے اور ایک مدت تک اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد لنکا پہونچے اور بڑی دقت سے اس نے اس محل خاص میں جس میں بدذات راون نے سیتاجی کو نظربند کر رکھا تھا رسائی حاصل کی۔ اس نے دیکھا کہ چند سیاہ فام وزشت رو عورتیں سیتاجی کے گردوپیش حلقہ کئے ہوئے بیٹھی ہوئی ہیں اور ان کو ترغیب وتحریص دے رہی ہیں، اور سیتاجی مغموم وخاموش بیٹھی ہوئی ہیں۔ اتنے میں سفاک راون محل میں داخل ہوا اور سیتاجی کو مخاطب کرکے کہنے لگا کہ "دیکھو ایک ماہ کا اور وقفہ دیتا ہوں، میری بات مان لو ورنہ بہت ظالمانہ سلوک کرونگا۔" سیتاجی نے مردانہ وار جواب دیا کہ "اے ظالم تو مجھے قتل کردے، جلادے، جو چاہے سزا دے لیکن میں تیری طرف نظر اُٹھاکر بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

"اس کے بعد موقع پاکر ہنومان جی گنجان درختوں کی آڑ سے جہاں وہ چھپے ہوئے تھے نکلے اور سیتاجی کو رام چندرجی کی انگوٹھی دکھاکر اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اُن کے قاصد ہیں اور اُن کی تسلی وتشفی کی۔ وہاں سے واپس آکر اُنھوں نے کل حالات رام چندرجی سے بیان کئے، جس پر رام چندجی نے ان کی امداد سے ایک بڑی فوج تیار کرکے لنکا کو روانہ ہوئے اور راون کو قتل کرکے سیتاجی کو واپس لے آئے۔"

"رام چندرجی معرکۂ لنکا سر کرکے اور مدت جلاوطنی ختم کرکے واپس آئے اور بھرت جی کے تخت وتاج

سے انکار کرنے پر ان کی تاجپوشی کی رسم دھوم دھام اور شان و شوکت سے ادا کی گئی۔ اور خوشی میں ایک معتدبہ زمانہ گذر گیا اور سیتاجی کے آثار حمل نمودار ہوئے تو اجودھیا کی رعایا میں باہم سرگوشیاں ہونے لگیں اور رام چندر جی نے ظاہر بیں جاہل طبقہ کے اس ہنگامۂ شک و اشتباہ کو دُور کرنے کے لئے ایک عام مجمع کے سامنے سیتاجی کی عفت اور پاکدامنی کی آزمایش کی۔ دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھائے گئے اور سیتاجی سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ باعصمت ہیں تو انگاروں پر سے برہنہ پا گذر جائیں سیتاجی بے خوف و خطر بغیر کسی پس و پیش کے ان انگاروں پر اس طرح گذر گئیں کہ ان کو آنچ تک نہ لگی۔ ہزارہا لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا لیکن بعض لوگوں کے دل صاف نہ ہوئے چنانچہ رام چندر جی نے رعایا کے پاس خاطر سے سیتاجی کو بالمیک جی کی کُٹی پر پہونچا دیا، جہاں چند ماہ بعد ہی ان کے بطن سے توام لڑکے لو اور کُش پیدا ہوئے۔ ان دونوں بچوں کے بُشرے سے جلال شاہانہ اور تمکنت خسروانہ ہویدا تھی۔ اشومیدھ جگ کی تقریب میں یہ دونوں لڑکے بالمیک جی کے ہمراہ شریک ہوئے اور متفقہ طور پر یہ قرار دیا گیا کہ ان لڑکوں کو شاہی خاندان میں پرورش پانے کا حق ہے۔ اس جلسہ میں سیتاجی کو واپس بلا لینے کی تحریک بھی کی گئی لیکن چند بدباطن لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور جب سیتاجی کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ اس روح فرسا و جگر خراش واقعہ کی تاب نہ لاسکیں۔ بیہوش ہو کر فرشِ خاک پہ گر پڑیں اور پھر کبھی ہوش میں نہ آئیں۔"

غرض سیتاجی نے سوانح حیات میں عفت و عصمت، مروت و وفا، خودداری و ضبط نفس وغیرہ تمام صفاتِ حسنہ کے ایسے اسباق موجود ہیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی عورتیں درس بصیرت لے سکتی ہیں اور اُنکے نقوش قدم پر چلکر عزت و ناموری حاصل کر سکتی ہیں۔

(نوٹ) صرف یہی بات نہ تھی بلکہ ان لڑکوں نے خود اشومیدھ یگیہ کے گھوڑے کو باندھ کر مہاراجہ رام چندر وغیرہ سے جنگ بھی کی تھی، اور اُن کو شکست دی تھی۔ ایسا زبردست کام بجز رامچندر جی کے لڑکوں کے اور کون کر سکتا تھا؛ یہاں اس قدر بتلا دینا اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اشومیدھ یگیہ ہند کے زمانۂ قدیم میں کسی راجہ کی جانب سے اپنے شہنشاہ ہونے کے اعلان میں کیجاتی تھی۔ ایک گھوڑا آزادانہ طور پہ چھوڑ دیا جاتا تھا جس کی ہمراہی میں راجہ کی فوج ہوتی تھی۔ رواج تھا کہ اگر کوئی دوسرا راجہ اُس گھوڑے کو باندھ لے تو فوج سے جنگ کرکے یا تو اُسے ہزیمت دے یا گھوڑا واپس کرے۔ بہرحال جب تک گھوڑا اپنی حسب خواہش ملک بھر کا گشت لگا کر راجہ کے یہاں واپس نہ آجائے اُس وقت تک وہ راجہ یگیہ کرنے کا اہل نہ سمجھا جاتا تھا (اڈیٹر)

ایک غیر معروف مرثیہ گو

افسردہ

(از مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی۔اے)

مجھے ایک قلمی کتاب دستیاب ہوئی ہے جس میں واقعہ خوانی کے طرز پر نثر عبارت کے ساتھ پرانے مرثیے بھی ہیں، کتاب کے ابتدائی اوراق غائب ہیں اور صفحوں پر ہندسے بھی نہیں پڑے ہیں، خاتمہ پر کاتب کا نام یا سن کتابت بھی درج نہیں ہے۔ البتہ ایک مرثیہ پر لکھا ہے "من کلام مرزا جعفر علی فصیح سلمہ اللہ" جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب مرزا فصیح کے دوران زندگی میں لکھی گئی۔ مرزا فصیح ناسخ اور میاں دلگیر کے شاگرد اور میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق کے ہمعصر تھے۔ اس طرح زمانہ کا کچھ نہ کچھ تعین ہو جاتا ہے، کتاب کا خط پاکیزہ ہے مگر اغلاط املا بہت ہیں۔

واقعہ خوانی مرثیہ کی ایک قسم ہے، ایک زمانے میں اس کا خاصا رواج تھا مگر اب یہ طرز خواندگی بہت کم ہو گیا ہے۔ واقعہ خوانی میں زیادہ حصہ نثر کا ہوتا ہے کہیں کہیں نظم کا جوڑ بھی لگا دیتے ہیں جس کی خوبی یہ ہونا چاہیئے کہ گویا اسی نثر کے سلسلے میں بیساختہ موزوں ہو گئی۔ نمونہ کے طور پر ایک حصہ اسی کتاب سے نقل کرتا ہوں، اس سے نثر کا انداز بھی معلوم ہو جائیگا:-

"حضرت ابراہیم بہ استماع واقعہ کربلا زار زار روئے، بحدیکہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ خطاب الٰہی پہونچا کہ اے خلیل میرے ثواب اس رونے کا زیادہ تر ہے ہزار درجہ قربانی اسمٰعیل سے جو ہماری راہ میں کرتا۔ (نظم)

شہر بانو سن کے یہ احوال گریاں ہو گئی — صورت تصویر وہ سکتے میں حیراں ہو گئی
تھام کر پھر اپنے دل کو شہ سے رو رو عرض کی — واقف راز الٰہی بات تم نے کیا کہی

حضرت نے فرمایا کہ یہ امر شدنی ہے کہ بعد شہادت جمیع اقربا نوبت علی اکبر کی پہونچے گی اور پھر میں یہ صدمہ جانکاہ اٹھا کر شہید ہونگا شہر بانو نے کہا کہ اے بادشاہ دو عالم یہ اندوہ اور مصیبت مجھ پر گزرے گی۔ (نظم)

ہائے کیا مجھ سے جدا ہوگا مرا اکبر علی　　ہائے اُس کے حلق پر آ دیگی دشمن کی چھری
ہائے رونا ہے مجھے یعقوب سال ہجران سے　　چھوٹ جاؤں گی مگر اپنے مہِ کنعان سے

اسی کتاب میں کچھ رباعیاں اور ایک سلام ناتمام اور مکمل و نامکمل مرثیے بھی ہیں۔ ایک رباعی تو لاجواب ہے۔ افسوس مصنف کا نام نہیں دریافت ہوسکا۔ ملاحظہ ہو:-

کس نے شبیر سا تعب دیکھا ہے　　اپنے کنبے کو قتل سب دیکھا ہے
عباس علی سوا جہاں میں یارو　　سقا بھی کسی نے تشنہ لب دیکھا ہے

چونکہ دلگیر کے مرثیے کے پہلے درج ہے خیال ہوتا ہے کہ انھیں کی ہو گی۔

مرثیوں کی تفصیل یہ ہے:-

پہلے دو مرثیے افسردہ کے ہیں، تیسرا مرثیہ خلیق کا ہے، چوتھا فصیح کا، پانچواں عزا کا۔ چھٹا میر خلیق کا اور ساتواں دلگیر کا۔ گو مقطع میں دلگو ہے جو یقیناً کتابت کی غلطی ہے۔ دلگیر کا مرثیہ مکمل نہیں ہے بلکہ ایک جز جس میں ایک روایت نظم ہے۔ واقعہ خوانی کے سلسلہ میں آگیا ہے۔

افسردہ کے متعلق تذکرہ آب حیات سے اتنا معلوم ہوا کہ سودا و میر کے معصر تھے اور سکندر و گدا و مسکین کی طرح صرف مرثیہ کہتے تھے۔ آزاد نے ان لوگوں کے کلام کے بارے میں من حیث المجموع یہ رائے قائم کی ہے:-

"تصنیفات مذکورہ کو دیکھو تو فقط تبرک ہیں کیونکہ ان بزرگوں کو نظم مذکور سے فقط گریہ و بکا اور ثواب مقصود تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ نیک نیت لوگ حسن تاثیر سے اپنے مقصود میں کامیاب تھے، شاعری اور صنائع انشا پردازی سے کچھ غرض نہ تھی۔"

جیسا آزاد نے لکھا ہے ان کے مرثیوں میں کوئی مرثیہ ایسا نہیں ہے جو پچاس بند سے زیادہ کا ہو۔ زیر نظر مرثیے ایسے ہی ہیں۔ صرف مرزا فصیح کے مرثیے میں ساٹھ بند ہیں۔

ان مرثیوں میں وہ دھوم دھام نہیں ہے جو انیس یا دبیر کے مرثیوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ مگر جذبات نگاری اور تخئیل و محاکات کی خوبیاں نیز صنائع و بدائع کی کمی نہیں ہے۔ شکوہ و جزالت بھی جا بجا ہے۔ نادر و لطیف تشبیہیں اور استعارے بھی ہیں۔ افسردہ کا ایک پورا مرثیہ نقل کئے دیتا ہوں تاکہ ناظرین خود فیصلہ کرلیں مجھے اس امر کے اظہار میں مطلق تامل نہیں کہ اس مرثیے کی زبان سودا کے مرثیوں کی زبان سے کہیں بہتر ہے۔ اور ایسی روانی و سلاست و شیرینی ہے جو سودا کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی مجھے معلوم نہیں کہ افسردہ کا کلام کہیں محفوظ ہے۔ اگر نہیں ہے تو شاید اس مرثیے کی اشاعت تاریخ ادب اردو میں قابل قدر اضافہ کرے گی کیونکہ سودا کے زمانے سے لیکر ضمیر تک ہمارے پاس بہت کم نمونے اس دور کے مرثیوں کے موجود ہیں کم سے کم

میری نظر سے نہیں گذرے نہ مجھے علم ہے۔

افسردہ کا زیرِ نظر مرثیہ حضرت عباس کے حال میں ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے :-

جبکہ عباس کی دریا پہ سواری آئی (۱) بعد لشکر کے علمدار کی باری آئی
رو رو فرمایا کہ اب مرگ ہماری آئی قتل کرنے کو ہمیں فوج یہ ساری آئی
اپنے خالق سے دعا کی کہ مری بات رہے
جائے سر ہاتھ سے، میدان مرے ہات رہے

اس بند میں خاص طور پر جو بات پسند آئی یہ ہے کہ فطرت کے مطابق ہے، حضرت عباس شجاع ولد شجاع تھے تاہم لشکرِ عظیم کے مقابل تنِ تنہا پہونچ کے اپنی بیکسی پر بے اختیار دل بھر آیا، مگر فوراً ہی ہمت دستگیر ہوتی ہے غیرت جوش میں آتی ہے اور خدا سے توفیق چاہتے ہیں کہ سر جائے مگر بات رہ جائے۔ اسی بات رہنے کو میدان ہاتھ رہنا کہکر افسردہ نے بلاغت کا اعلیٰ نمونہ دکھایا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ جنگ میں فتح و شکست کچھ اہمیت نہیں رکھتی، اصل فتح مردوں کا اپنی بات پر قائم رہنا اور امرِ حق کی حمایت میں جان تک قربان کر دینا ہے۔

بیت میں دو محاورے، بات رہنا اور میدان ہاتھ رہنا نظم ہیں۔ آج کل کی زبان کے اعتبار سے صرف سر جائے کہیں گے نہ کہ سر ہاتھ سے جائے

یا الٰہی میں ترے شیر کا بیٹا ہوں جواں (۲) مجھکو ما و بنی ہاشم سبھی کہتے ہیں یہاں
ہے پیمبر کے نشاں کا یہ مرے ہاتھ نشاں مشک لے آیا ہوں اک پیاسی ہے دخترِ نادان
فوجِ دشمن ہے کھڑی اپنی صف آرائی میں
آبرو پاؤں سکینہ کی میں سقائی میں

میں یہ سنتا ہوں مرا عم تھا علمدارِ رسول (۳) یا علمدار مرا باپ تھا غمخوارِ رسول
آج شبیر ہے سردار، یہ دلدارِ رسول اُسکی خدمت جو کرے ہے وہ مددگارِ رسول
یا الٰہی مجھے عہدہ ہے جو غم خواری کا
حق ادا مجھ سے ہو سرور کی علمداری کا

جب ستم دستِ ستم سے یہ کریں اہلِ ستم (۴) ہے دعا اپنے مکاں سے نہ ہٹیں میرے قدم
جب تلک ہاتھ ہیں یہ ہاتھ سے چھوٹے نہ علم گرچہ بیکس ہوں یہ کافی ہے ترا فضل و کرم
آبرو پاؤں جو دریا کا کنارا پاؤں

پانی لیکر جو پھروں جان دوبارا پاؤں

مندرجہ بالا بندوں میں اُس دعا کی توضیح ہے جو حضرت عباس نے مانگی۔ چوتھے بند میں صنعت براعت استہلال نہایت خوبی سے صرف ہوئی ہے، اس کے تیسرے مصرع میں دست مبارک قلم ہونے اور پانچویں مصرع میں کنار دریا شہید ہونے کی طرف اشارہ ہوگیا۔ چوتھے بند کے دوسرے مصرع میں لفظ مکان کی جگہ اب مقام لائیں گے۔ بعد کے چار بندوں میں حضرت عباس نے اپنے دل اور ہاتھوں اور گھوڑے اور تلوار کو مخاطب کیا ہے۔ یہ پیرایۂ بیان بہت دلکش ہے۔

(۵) دیکھ چشموں سے کہ دریا یہ پڑا بہتا ہے
یہ دعا کرکے کہا دل سے ارادہ کیا ہے
فوج ہے سورہ ملخ، تو وہ تن تنہا ہے
شاہ بھی پیاسے ہیں ناموس بھی سب پیاسا ہے
میں شجاعت کا ذرا تجھ سے اشارا لے لوں
تیغ کی آب سے دریا کا کنارا لے لوں

(۶) جو گوارا ہے تجھے بات، وہ ہے مجھکو پسند
دل لگا کہنے کہ تو چل، مری ہمت ہے بلند
حلقۂ فوج شقاوت سے نہ تو پابند
آپ لے بڑھ سے، پیاسا ہے نبی کا فرزند
چشمۂ فیض شجاعت ہے علم کے نیچے
ایک حملے میں تو دریا ہے قدم کے نیچے

بیت کا زور ملاحظہ طلب ہے۔

(۷) اب تلک حکم سے سب تم نے کئے میرے کام
اپنے ہاتھوں سے کہا تم سے بھی ہے میرا کلام
جب تلک تن میں ہو مت چھوڑیو قبضہ حسام
یہ گھڑی وہ ہے کہ ہوتا ہے مرا کام تمام
دو طرف دونوں میں تقسیم یہی کام رہے
ایک سے تیغ چلے، ایک علم تھام رہے

(۸) زور ہاتھوں میں جو تھا اُسنے دو چند اُن پایا
جب یہ بات ابن ید اللہ زباں پر لایا
وقت آخر ہے سواری کا یہ میری آیا
اپنے پھر تازیِ چالاک سے یوں فرمایا
تو رفاقت مری اس وقت ذرا کر تازی
حق سواری کا مری آج ادا کر تازی

(۹) جست و چالاک کیا تازی نے سب اپنا بدن
بات یہ سنتے ہی گھوڑے نے اُٹھائی گردن
قبضۂ تیغ سے فرمانے لگے پھر یہ سخن
جانا عباس نے ہے کام کا میرے توسن

سیفِ حیدر کے عمل شاہِ زماں سے ہونگے
میرے جوہر یہ عیاں تیری زباں سے ہونگے

اِن بندوں میں بھی فطرت کی مطابقت ہے۔ مابعد کے شعرا کی طرح گھوڑے یا تلوار کو انسانی قوت نطق سے متصف نہیں کیا ہے۔ صرف دل تو بول اُٹھتا ہے کہ بڑھو میری ہمت بلند ہے، مگر ہاتھ اس طرح بہک سکتے ہیں کہ حضرت عباس اپنے ہاتھوں میں پہلے سے دوچند قوت محسوس کرتے ہیں۔ گھوڑا اپنے دل کی بات گردن اُٹھانے اور طرارے بھرنے سے ظاہر کر دیتا ہے اور تیغ خود زبان حال بن جاتی ہے۔

کہہ کے یہ ڈال دیا قبضہ شمشیر پہ ہات (۱۰) نام اللہ کا لے کھینچ لی وہ برق صفات
یا علی کہہ کے چلا بر لب دریائے فرات شہ نے کی تب یہ دعا پیش مجیب الدعوات
فوجِ اعدا پہ مظفر مرا غم خوار رہے
سرخرو جنگ میں عباس علمدار رہے

کس معرکہ کا بند ہے اور کیسی لطیف و مربوط و بے ساختہ گریز ہے، افعال و حرکات کی ترتیب حقیقت سے اس قدر موافق ہے کہ محاکات کی بہترین مثال پیش کر دی ہے۔

شاہ کرتے تھے دعا، وہ تھا جھکا لشکر پر (۱۱) فوج نے دیکھا کہ اِک شیر ژیاں آیا اِدھر
ہر طرف گھیر لیا فوج نے رستہ آکر روبرو جو صفِ لشکر سے چلے تیغ و تبر
ایک پر نیزے ہزاروں جھکے اور تیر چلے
دیکھ یہ حال کمک کے لئے شبیر چلے

روکا اکبر نے کہ ہر شاہِ زماں جاتے ہو (۱۲) میں ابھی بیٹھا ہوں بابا جی کہاں جاتے ہو
چھوڑ اکبر کو شہ تشنہ لباں جاتے ہو بیٹے کب آؤ گے تم ایسے مکاں جاتے ہو
مجھ کو فرماؤ تو میں جاؤں مددگاری کو
ایک اکبر ہی یہ کافی ہے سپہ داری کو

شہ نے فرمایا یہ کیا بات تو کرتا ہے قیاس (۱۳) تیری امداد گوارا نہ کرے گا عباس
قطع ہے اُس پہ شجاعت کا دلیری کا لباس لاکھ تلوار پڑے کم نہ ذرا ہونگے حواس
کیا بہادر ہے وہ صفدر کوئی مجھ سے پوچھے
اُسکی شمشیر کے جوہر کوئی مجھ سے پوچھے

حضرت عباس بے حد غیور تھے، اُن کے کیرکٹر کا یہ پہلو آنسرد نے اس مصرع میں خوب نمایاں کیا ہے۔

کہ تیری امداد گوارا نہ کرے گا عباس"۔ اور یہ مصرع تو قابلِ ناز ہے ع قطع ہے اُسپہ شجاعت کا دلیری کا لباس

میرا بھائی ہے شجاعانِ عرب میں مشہور (۱۴) آج ہے اُسکو شجاعت کا دکھانا منظور
میں تجھے بھیجوں اُدھر بات ہے انصاف سے دور خیر مجھکو بھی رکھا جانے سے تونے مجبور

میں نہیں جاؤں گا، پردیکھ وہ کیا کرتا ہے
کیا علمدار ہی کا حق آج ادا کرتا ہے

پشتۂ خاک تھا اُس جا پہ نہایت جو بلند (۱۵) جا کھڑے اُس پہ ہوئے شاہِ زماں اور فرزند
حلقہ زن فوج تھی عباس پہ واں مثلِ کمند جاوے دریا میں وہ کس طور ہر اک راہ تھی بند

جس طرف نعرہ کناں تھام کے شمشیر جھکا
فوجِ روباہ پہ میداں میں گویا شیر جھکا

تیسرے مصرع میں تشبیہ کی ندرت اور مناسبت قابلِ داد ہے۔ گویا کا واؤ دبتا ہے اور یہ آجکل معیوب ہے۔

سیکڑوں اس تنِ تنہا پہ چلے تیغ کے وار (۱۶) روکتا جاتا تھا تلوار پہ اُن کی تلوار
سب کو زخمی کیا زخمی نہ ہوا وہ زنہار فوجِ اعدا کی ہوئی روبرو اُسکے سے فرار

شاہ نے دیکھا علم برلبِ دریا پہونچا
بولے دریا پہ وہ سقائے حرم جا پہونچا

بیت میں صرف اتنا کہہ دینے سے کہ علم برلبِ دریا پہونچا اور اس امر کو حذف کر دینے سے کہ حضرت عباس لڑتے ہوئے دریا تک پہونچ گئے، فوجِ مخالف کا ہجوم جس میں حضرت عباس گھرے ہوئے تھے کس خوبی سے ثابت ہوا۔ بیت کا آخری مصرع اپنی بے ساختگی میں حضرت امام حسین کی مسرت و فخر و ناز اور حضرت عباس کی شجاعت پر اعتماد کو عجب انوکھے طرز سے ادا کر رہا ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ حضرت علی اکبر کو بغیر تخاطب جواب مل گیا کیونکہ وہ اس سے پہلے حضرت عباس کی مدد کو جانے کے لئے کہہ رہے تھے۔

اہلبیتِ نبوی در پہ کھڑے تھے یک جا (۱۷) ماجرا جنگ کا عباس کی سب نے دیکھا
شہ کو آواز دی زینب نے باصد درد و بکا بھائی صاحب برادر آؤ تو کیا ہے کہتا

شاہ اکبر کو لیئے خیمے کے در پر آئے
بولے عباس گیا، دیکھئے کیونکر آئے

آخری مصرع علم النفس کے مسئلہ ردِ عمل (Reaction of feelings ؟) کی شرح ہے۔ پہلے وہ شادمانی تھی جس کا اظہار اس مصرع سے ہوا ع (بولے) دریا پہ وہ سقائے حرم جا پہونچا۔ اب جو اس سے پریشانی ہے

انتشار ہے ع (بولے) عباس گیا دیکھیئے کیونکر آئے۔ ایک ایک لفظ سے کس قدر محبت ٹپکتی ہے۔

عرض زینب نے یہ کی میں نے لڑائی دیکھی (۱۸) بھائی جاں کیا ہی شجاعت ہی علمدار نے کی
شہ نے فرمایا کہ تم دیکھ رکھو حال سبھی ایک دن تم کو گواہی یہی دینی ہوگی
اس کی مادر سے بیاں کیجیو جرأت اس کی
غمخوری، تشنہ لبی اور شجاعت اس کی

اِس بند میں افسردہ نے شاعری کا معجزہ دکھا دیا ہے۔ یہ بند تعریف سے مستغنی ہے۔ اِن چند مصرعوں میں تمام واقعات ماقبل و مابعد کربلا کی طرف اشارہ ہوگیا۔ نہایت مختصر الفاظ میں کچھ بیان کرتا ہوں۔

حضرت عباس کی والدہ حضرت ام البنین ایسے قبیلہ سے تھیں جو عرب میں بھی اشجع مانا جاتا تھا۔ حضرت علی نے آپ سے عقد اس لئے کیا تھا کہ ایسا فرزند پیدا ہو جو شجاعت میں بے نظیر ہو اور امام حسین علیہ السلام کے پسینے پر اپنا خون بہائے کیونکہ ان حضرات کو واقعات کربلا کا پہلے سے علم تھا۔ معرکۂ کربلا کے وقت حضرت ام البنین والدۂ حضرت عباس زندہ تھیں مگر ہمراہ نہیں گئی تھیں بلکہ مدینہ میں قیام تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جب میرے بعد سیدانیوں کا لٹا ہوا قافلہ مدینے واپس جائیگا اور حضرت ام البنین کو معلوم ہوگا کہ حضرت امام حسین شہید ہوگئے تو ممکن ہے یہ شبہ پیدا ہو کہ عباس سے جو اُمیدیں وابستہ تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اُس نے جاں نثاری کا حق اچھی طرح ادا نہیں کیا ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ہمراہ رکاب ہو اور حسین شہید ہو جائیں۔ اللہ اللہ کیا محبت تھی حضرت امام کو اپنے شیدائی عباس سے۔ یہ نہیں گوارا ہے کہ عباس کی وفاداری پر کسی قسم کا شبہ اُن کی والدہ حضرت ام البنین کو ہو لہٰذا حضرت زینب سے فرماتے ہیں کہ تم گواہ ہو کہ عباس نے کیسی دادِ شجاعت دی۔ اور کس جوانمردی سے تین دن کی بھوک پیاس میں دشمنوں سے مقابلہ کیا۔

ضمناً حضرت ام البنین کے کردار پر بھی کیسی اچھی روشنی پڑتی ہے اُن کو فرزند کے مرنے کا غم پیچھے ہوگا پہلے یہی خیال گزرے گا کہ عباس نے جوہر شجاعت دکھانے میں تو کمی نہیں کی، خاندان کی آن کو قائم رکھا کہ نہیں۔ حضرت عباس کا مقصد حیات ہی یہ تھا کہ امام حسین علیہ السلام کے قوت بازو ثابت ہوں۔ اس مقصد کی تکمیل میں تو کوئی فروگذاشت نہیں ہوئی۔

سب حرم رونے لگے شاہ کا سُن کر فرمانا (۱۹) بولی زینب کہ مرا حیف وطن میں جانا
تم نہ ہو ساتھ تو دشوار ہے منہ دکھلانا لوگ پوچھیں گے تمہارا ہوا کیونکر آنا
کون سے منہ سے کہیں گے کہ وہ سب قتل ہوئے پیاس سے خستہ جگر جان بلب قتل ہوئے

یہ بند میرے بیان کردہ مطلب کی تصدیق کرتا ہے۔

ابھی کہتی تھی یہ زینب جو اُدھر شور اُٹھا (۲۰) کہتے اعدا تھے کہ ہے آب علمدار چلا
سب خبردار رہو روک لو رستہ اس کا دو جواں اور بھی باقی ہیں بمیدانِ وغا
پانی پہونچے گا یہ پیاسوں کے اگر کام تلک
جنگ کا خاتمہ ہو ویگا نہ پھر شام تلک

اِس میں شام کا لفظ بہت پُر مغز ہے، ایک تو یہی کہ آج شام تک لڑائی ختم نہ ہوگی اور دوسرے دن نہ معلوم کیا رنگ ہو۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر ان تین پیاسے شیروں کو پانی مل گیا تو پھر تازہ دم ہوکر ایسے حملے کریں گے کہ فوج کے قدم اُکھڑ جائیں گے اور یہ غازی سب کو بھگاتے ہوئے ملک شام تک لیجائیں گے اور ممکن ہے کہ یزید کے پایۂ تخت کی بنیادیں ہلادیں۔ پیاس ہی ہے جو اُن کو ہلاک کئے دیتی ہے، پانی نہ پائیں ورنہ ان پر فتح پانا محال ہے۔

شاہ نے دیکھا جو ہیں فوج میں دامانِ علم (۲۱) سمت دریا کے چلے لے کے لپسر کو باہم
تھے ابھی راہ میں شبیر ہوا یاں یہ ستم ہاتھ عباس کے دونوں ہوئے یکبار قلم
اب علم گرنے کو ہے اُس نے یہ معلوم کیا
دامنِ چشم سے دامانِ علم چوم لیا

آخری مصرع کس قدر دلخراش ہے اور اُسی کے ساتھ اس علم یا نشان کی جو عظمت و وقعت حضرت عباس کی نگاہ میں تھی اُس کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

جنگ میں ہو گئے مصروف اُدھر سبطِ نبی (۲۲) اس طرف مشک تھی عباس نے دندان میں لی
شیر دریا سے چلا آتا تھا اُس دم زخمی شام کے ابر سے تیروں کی تھی بارش ہوتی
مشک پر تیر لگا، اُس نے بہایا پانی
بولے عباس کہ پیاسوں نے نہ پایا پانی

معاذ اللہ اس مصرع سے کس قدر یاس اور حسرت ولولہ امید دل کا خون ٹپکتا ہے ع

بولے عباس کہ پیاسوں نے نہ پایا پانی

اگر میر انیس نے بھی یہ مصرع کہا ہوتا تو فخر کرتے

مشک کو چھوڑ دیا اُس نے دہاں سے اپنے (۲۳) دل کو بس توڑ دیا رشتۂ جاں سے اپنے
ہوش پر جا کئے پھر تاب و تواں سے اپنے دیکھے آواز کہا شاہ زماں سے اپنے

ہو گئے ہاتھ قلم مشک و علم چھوٹ گئے
اب گرا میں کہ رکابوں سے قدم چھوٹ گئے

معلوم ہوتا ہے کہ افسردہ عالم نفسیات تھا، اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو اس مقام پر ہر مرثیہ گو نے یہی نظم کیا ہے کہ حضرت عباس جب گھوڑے سے گرنے لگے تو امام حسین کو آواز دی کہ آقا مدد کو تشریف لائیے، غلام آپ پر نثار ہوا۔ افسردہ نے ان تعلقات کو پیش نظر رکھا جو ان دونوں بھائیوں میں تھے۔ امام انام حضرت عباس کو نہ صرف اپنا قوت بازو سمجھتے تھے بلکہ اولاد کی طرح محبت کرتے تھے، اُدھر حضرت عباس کو بھائی کی غلامی کا ادعا اور اس غلامی پر ناز تھا۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے افسردہ نے بخلاف دوسرے شاعروں کے طلب امداد کے بجائے حضرت عباس کی زبان سے صرف یہ الفاظ کہلوائے ع اب گرا میں کہ رکابوں سے قدم چھوٹ گئے۔ آقا سے غلام کا طالب امداد ہونا سوء ادب تھا۔ بھائی کا بھائی سے مدد چاہنا اعتماد محبت کے منافی تھا، صرف واقعہ کا علم حضرت امام کو ہو جانا چاہیئے، غلام کی مدد کو آقا، بھائی کی مدد کو بھائی ضرور تشریف لائیں گے، درخواست کیسی؟

شہ نے آوازِ برادر بھائی کی سُنی یہ پُر جوش (۲۴) کیا ہی حملہ کیا اُس فوج میں باجوش وخروش
لاش پر لاش گرا خاک پہ دی دوش بدوش روکے اب کون کہ اس فوج کے جاتے رہے ہوش

باپ بیٹے یہ وہاں دونوں ہی باہم پہونچے
دم تھا عباس میں تھوڑا سا یہ اُس دم پہونچے

فوج نے کہا کہ لاشہ نہ اُٹھانے پاویں (۲۵) دو جواں اس تن زخمی کو نہ گھر پہونچا دیں
تیر برساؤ نہ گھوڑوں سے اُترنے پاویں گھیر لو چار طرف بس میں ہمارے آویں

تیر برساتے تھے ہر ایک پیاسے کی طرف
تیر چلتے تھے محمدؐ کے نواسے کی طرف

باپ بیٹے نے جو پھر گھوڑے اُٹھائے اُس دم (۲۶) ضرب شمشیر سے لشکر کو کیا پھر برہم
جبکہ میدان وہ خالی ہوا از فوج ستم اُترے گھوڑوں سے جواں دونوں بچشمِ پُرنم

شہ نے عباس کو پایا تو سسکتا پایا
جوں چراغ سحری دن کو چمکتا پایا

تشبیہ جس جگہ اور جس طرح صرف ہوئی ہے قابل تحسین ہے، لفظ "سسکتا" کے شمول نے ادھ جار چاند لگا دیئے چراغ سحری کا بھڑک بھڑک کر بجھنا سسکنے سے کس قدر مشابہ ہے۔

بیٹھ کر لاش کے نزدیک پکارے بھائی (۲۷) دیکھو ہم آئے ہیں ملنے کو تمہارے بھائی
میرے بازو، مرے ہمدم، مرے پیارے بھائی اے سپہر بنی ہاشم کے ستارے بھائی
عزم تم نے جو علمدار کیا کوثر کا
خاتمہ ہو گیا شبیر کے اب لشکر کا

اِس بند کی روانی، زبان کی شستگی، جذبات کی گہرائی اور تدریجی ترقی آفسردہ کے سلیقۂ مرثیہ گوئی کا آئینہ ہے۔

کہہ کے یہ زانو پہ اپنے لیا عباس کا سر (۲۸) دل کو زخمی کے ہوئی بھائی کے آنے کی خبر
آنکھ کو کھول کے بس دیکھ لیا ایک نظر اور تبسم بھی عیاں اُسکے ہوا ہونٹوں پہ
شہ نے فرمایا شہادت کی خوشی کرتے ہو
حیف بیکس مجھے عباس ابھی کرتے ہو

دوسرے مصرع کے الفاظ کہ "زخمی کے دل کو خبر ہوئی" اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ زخموں کی کثرت سے حضرت عباس پر غشی طاری تھی۔ شاعر نے کوئی غیر مانوس وجہ دل کو خبر ہونے کی قائم نہیں کی بلکہ ایک مادی سبب تجویز کیا یعنی یہ کہ سر زانو پر اُٹھایا گیا جو کافی وجہ بے خبری سے ہوش میں لانے کی ہو سکتی ہے۔ اُسی کے ساتھ بھائی کی محبت اور محبت کی کشش کے اظہار کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود بخود دل کو خبر ہو گئی۔ اس کی وضاحت مابعد کے مصرع سے ہوتی ہے کہ آنکھ بعد کو کھولی۔ "ایک نظر دیکھ لیا" یہ الفاظ ایسے ہیں جن سے ایک طرف تو غشی کی شدت کا اظہار ہوتا ہے اور ایک طرف افراطِ محبت کا جو حضرت عباس کو امام حسین سے تھی۔ یعنی جس قدر بھی طاقت باقی رہ گئی تھی اُس سے مستفید ہو کر بھائی کو دیکھکر خوش بھی ہوئے اور محبت کا بھی اظہار کیا۔ دیکھنا محبت کی اور مسکرانا دلی مسرت کی دلیل ہے۔ مسکرانا ایک اور بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ نزع میں وہ اطمینان قلب نصیب ہوا جس کے واسطے چند آخری لمحے محفوظ کر لئے گئے تھے۔ اُن کی تعداد اتنی کم تھی کہ تمام و کمال صرف کر دینے پر بھی ایک نظر سے زیادہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دوسری نظر چہ جائیکہ زبان سے کوئی لفظ ادا کرنا امکان سے باہر تھا۔

ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ دل کو بھائی کے آنے کی خبر ہونا یہاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ بھائی کے سوا اور کون ہمدردی کرنے والا ہو سکتا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو دل کو خبر ہونا کوئی خاص بات قابل تذکرہ نہ ہوتی۔ مگر کم سے کم دو شخص ہمدردی کرنے والے ایسے تھے جو میدان میں جا کر ہمدردی

کر سکتے تھے۔ یعنی حضرت امام حسینؑ اور حضرت علی اکبر۔ لہٰذا شاعر نے اُس احساس کی طرف توجہ دلائی جس کو تحت الشعور (Sub-Consciousness) کہتے ہیں۔ مَیں نے دائرۂ انتخاب کو دُو اشخاص میں محدود کر دیا تاکہ شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ غشی کی حالت میں حضرت عباس کو خیمے میں اٹھائے گئے ہوں اور اس حالت میں زانو پر سر لینے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہو سکتا ہے علاوہ اس کے غشی کے بعد جب پہلی خبر دل کو ہو وہ بھائی کی آمد کی ہو تو اس میں اس احساس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے کہ زخمی کو یہ سمجھنے کا موقع تھا کہ ہمدردی کرنے والوں کی تعداد کم ہو کر بھائی اور بھتیجے میں محدود ہو گئی ہے بلکہ تحت الشعور یا نیم شعوریت نے بغیر کسی امداد کے بھائی کا علم حضوری پیدا کر دیا اور اس نتیجے پر پہونچا دیا کہ بھائی نے سر اُٹھا کے زانو پر رکھا ہے۔ لفظ "ہوئی" اس بات پر دلیل ہے۔

آگے تم جاتے ہو اور پیچھے سے میں آتا ہوں (۲۹) اب نہیں دیر ہے سر اپنا میں کٹواتا ہوں
کوئی دم باقی ہے، کوثر پہ تمہیں پاتا ہوں غم تو کھایا ہے پر اب تیغ و تبر کھاتا ہوں
مَیں تو مرجاتا ابھی، تھامے ہے اکبر مجھکو
داغ دکھلانے کو باقی ہیں برادر مجھکو

بیت میں حضرت علی اکبر اور چھ مہینے کے علی اصغر کی شہادت کی طرف اشارہ ہے

اب مجھے خلق میں جینے کا نہیں ہے یارا (۳۰) تم کو مارا نہیں دشمن نے یہ مجھ کو مارا
ہو گیا صبر کا اب میرے گریباں پارا مجھ سا بیکس نہ کوئی ہو نہ کوئی بیچارا
قتل میں ہوں گا نہیں کوئی بچانے والا
رن سے لاشے کا نہیں کوئی اُٹھانے والا

سر مرا جائیگا جب شام کو بر نوک سناں (۳۱) سر تمہارا بھی چلے گا مرے ہمراہ وہاں
ہے جدائی یہ کوئی دم کی تری بھائی جاں ورنہ ہم تم سے جُدا ہو دیں یہ کیا ہے امکاں
ہر مکاں مونس و غمخوار ہمارے تم ہو
حشر کے دن بھی علمدار ہمارے تم ہو

یہ تو بتلاؤ سکینہ کو میں کیا دوں گا جواب (۳۲) جب کہے گی کہ چچا کو مرے لے آؤ شتاب
ہو گیا خیمے کے جلنے سے بھی اب مجھکو حجاب زندگانی کہیں آخر ہو مری مثل حباب
تم چلے سبطِ نبی بیکس و بے یار ہوا
اب ہوں مشتاق اجل جینے سے بیزار ہوا

شہ ابھی کہتے تھے عباس نے دی آنکھ پھرا (۳۳) ایک ہچکی جو اُسے آئی تو دم ٹوٹ گیا
شہ کے زانو پہ سر اُس کا جو ہیں یکبار جھکا روئے شبیر علمدار کا اب کوچ ہوا
شاہ نے جس گھڑی بے جان وہ دیکھا بھائی
یوں کہا ہم نے خدا کو تمہیں سونپا بھائی

سر جھکنے سے مراد منکا ڈھلنا ہے۔

ہوگیا چشموں سے شبیر کے دریا جاری (۳۴) آہ اک شور سے اکبر نے جو کی یکباری
سُن کے آواز حرم بولے یہ باصد زاری اب علمدار کے ماتم کی کرو تیاری
ہوگیا ہم کو یقیں شاہ کا غمخوار گیا
خلق سے سید شہدا کا علمدار گیا

شُہدا میں (ہ) ساکن پڑھنے سے مصرع موزوں ہوگا۔ یہ تلفظ مرثیہ کی قدامت پر دلیل ہے۔

لے لیا ساتھ سکینہ کو حرم نے جلدی (۳۵) پیٹتے روتے ہوئے آئے جو ڈیوڑھی پہ سبھی
دیکھا دریا سے تو آتی ہے سواری شہ کی غیر اکبر کے نہیں آتا ہے ہمراہ کوئی
نا علمدار ہے نا شہ کا علم آتا ہے
شاہ کے ساتھ فقط لشکر غم آتا ہے

دیکھے آواز پکارے یہ سبھی گریہ کناں (۳۶) کیا کیا تم نے علمدار امام دو جہاں
تم چلے آتے ہو عباس دلاور ہے کہاں چھوڑ دریا پہ اُنھیں آئے شہ تشنہ وہاں
سرنگوں شرم سے شبیر چلے آتے تھے
صبر سے تابع تقدیر چلے آتے تھے

پہونچے خیمے کے جو نزدیک امام دوسرا (۳۷) اُس گھڑی زوجۂ عباس کی جانب دیکھا
اتنا فرمایا کہ اللہ کرے صبر عطا جوش زاری جو ہوا پھر کوئی کلمہ نہ کہا
دونوں ہاتھوں سے لیا چشموں پہ اپنا دامن
اس قدر روئے ہوا دامن دریا دامن

شہ کا یہ حال جو دیکھا تو حرم روئے پکار (۳۸) کون لے کس کی خبر حشر کے واں تھے آثار
گر پڑی خاک پہ غش کھا کے سکینہ یکبار بیچ میں اُس کو لیا آگے رہے ماتم دار
آگئے افسردہ کیسے تا بیاں باقی ہے تب تلک غم ہے یہ جبتک کہ جہاں باقی ہے

مرثیے میں صرف اڑتیس بند ہیں مگر انھیں میں سب کچھ ہے۔ وجدان گواہی دیتا ہے کہ ان میں کمی یا بیشی کی گنجایش نہیں۔ ہر شئے اپنی جگہ پر اور اُتنی ہی ہے جتنی ہونی چاہیئے۔ اثر آفرینی کے علاوہ وقوع نگاری اس پایہ کی ہے کہ ہر چیز کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، ترتیب ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک بند دوسرے سے بغیر کسی کاوش کے بیساختہ نکلتا آتا ہے۔ شکوہ و درد و خستگی اپنے اپنے محل پر ہیں اور حشو و زوائد کو مطلق دخل نہیں نہ بیکار کی لفاظی ہے۔

آئندہ کسی نمبر میں افسردہ کا دوسرا مرثیہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

علمی نثر کی خوبی

شعر کی مخصوص بنیادی خوبی اگر محبت کہی جاتی ہے تو نثر اور علمی و عقلی نثر کی عمدگی اس کے انصاف پر منحصر ہے۔ محبت اگر والہانہ و بے اختیارانہ اظہار چاہتی ہے تو انصاف کا تقاضا احتیاط اور صبر و استقلال ہے۔ انصاف کسی شخص یا کسی خاص واقعے کے متعلق نہیں بلکہ اس سے مراد عام عادت انصاف سے ہے جو ہر تخیل اور ہر بیان سے متعلق ہو۔ علمی و تحقیقی بیان کے لئے نثر نگار کا ذہن غیر مطمئن مگر اسی کے ساتھ غیر عاجل بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے تخیل اور طرز بیان کے ان تمام محاسن اور خوشنمائیوں سے بچتا ہوا چلتا ہے جو اصل موضوع سے متعلق نہیں ہوتے اور اس طرح اس کے تکملہ کے بعد اپنی خود ایک خوشنمائی اور خوبصورتی تیار کر لیتا ہے۔

ایک عمدہ علمی نثر کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران میں ہم لکھنے والے کی تحسین و ستائش میں مبتلا نہیں ہوتے اور نہ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں کوئی خاص سوال پیدا ہوتا ہے۔ بیان کی اہمیت اُس کی سنجیدگی اور اس کی خوبیٔ ترتیب ہماری توجہ کو اس درجہ معروف رکھتی ہے کہ ہمیں ان امور کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

(ہندوستانی)

یورپ اور امریکا کے کتب خانے

(از جناب ابوالفاضل راز چاندپوری)

برطانیہ | موجودہ زمانہ میں دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں برٹش میوزیم یعنی انگلستان کا قومی کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں مطبوعہ و قلمی کتابوں کی تعداد بہت ہے لیکن جہاں تک کتب خانہ کی تنظیم و ترتیب کا تعلق ہے برٹش میوزیم کے مقابلہ میں دنیا کا کوئی کتب خانہ پیش نہیں کیا جا سکتا، اس میں تیئیس لاکھ پچاس ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ستر ہزار قلمی کتابیں اور چوراسی ہزار چارٹ اور نقشے وغیرہ ہیں۔ اس کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ساٹھ جلدوں میں ہے اور سنہ ۱۵۰۰ عیسوی کی قبل چھپی ہوئی کتابوں کی فہرست چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

برٹش میوزیم کی بنیاد سنہ ۱۷۵۳ء میں سر ہنس اسلون کے ذخیرۂ کتب عطا کرنے پر رکھی گئی تھی اور اس وقت یہ کتب خانہ مانٹیگو ہاؤس میں قائم کیا گیا تھا جس کا افتتاح سنہ ۱۷۵۹ء میں ہوا تھا۔ موجودہ عمارت سنہ ۱۸۵۷ء میں تیار ہوئی تھی، مگر یہ عمارت ناکافی ثابت ہوئی اور وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۷۵۷ء سے اس کتب خانہ کو قانوناً یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ انگلستان کی ہر مطبوعہ کتاب کی ایک جلد اس کو مفت ملتی ہے۔

انگلستان میں برٹش میوزیم کے بعد دوسرے درجہ کا کتب خانہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا کتب خانہ ہے جس کی بنیاد سنہ ۱۴۳۹ء میں ڈیوک ہمفریز کی امداد سے رکھی گئی تھی۔ بعد میں یہ لائبریری آکسفورڈ یونیورسٹی کو دے دی گئی۔ اس وقت اس میں تیرہ لاکھ اٹھتر ہزار پانچ سو مطبوعہ کتابیں ہیں جن میں ایک کثیر تعداد قدیم زمانہ کی کتابوں کی بھی ہے۔ علاوہ ازیں چھبیس لاکھ متفرق ادبی مسودے اور چالیس ہزار قلمی کتابیں ہیں، نقشے وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی کا کتب خانہ بھی بہت بڑا ہے، اس کی بنیاد ٹامس اسکاٹ آرچ بشپ آف یارک نے سنہ ۱۴۷۵ء میں ڈالی تھی۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ سنہ ۱۷۱۵ء میں بادشاہ جارج اول نے بشپ مور کا کتب خانہ اس کو عطا کیا تھا۔ آج کل اس میں ایک کروڑ سے زیادہ مطبوعہ اور

دس ہزار قلمی کتابیں ہیں، ان میں انجیل مقدس کا ایک قلمی نسخہ سولھویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے یہ یونانی اور اطالوی زبانوں میں ہے اور ان زبانوں میں سب سے قدیم نسخہ مانا جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کا قومی کتب خانہ ۱۹۲۵ء میں قائم ہوا ہے۔ اس میں ستر لاکھ مطبوعہ اور بہت سی قلمی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔

ویلس کے قومی کتب خانہ کی بنیاد ۱۹۰۷ء میں رکھی گئی تھی، اس میں پچاس ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں اور پانچ ہزار قلمی۔

آئرلینڈ میں ٹرینٹی کالج (ڈبلن) کا کتب خانہ بھی کافی بڑا ہے اس میں مطبوعہ و قلمی کتابوں کی تعداد چالیس ہزار ہے۔

ویلس اور آئرلینڈ کے کتب خانوں کو ہر مطبوعہ کتاب کی ایک ایک جلد قانوناً مفت ملتی ہے۔

فرانس | فرانس میں پیرس کا قومی کتب خانہ بہت قدیم ہے۔ ۱۶۱۷ء سے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ حدود ملک میں جو کتاب شائع ہو اس کی دو جلدیں اس کو بلا قیمت ملتی ہیں انیسویں صدی کے شروع میں اس میں پچیس لاکھ مطبوعہ اور تراسی ہزار قلمی کتابیں تھیں۔ مگر انقلاب فرانس کے زمانہ میں اس میں کتابوں کا بہت اضافہ ہوا اور اکثر اصحاب کے ذاتی کتب خانوں کی کتابیں اس میں داخل کی گئیں، آج کل اس میں چالیس لاکھ مطبوعہ اور ایک لاکھ پچیس ہزار قلمی کتابیں ہیں اور پانچ لاکھ اخبار اور تیس لاکھ نقشے وغیرہ ہیں۔

روس | روس میں مشہور کتب خانہ لینن گراڈ کا قومی کتب خانہ ہے، اس کی بنیاد ۱۷۹۴ء میں رکھی گئی تھی، آجکل اس میں مطبوعہ کتابوں اور رسالوں کی تعداد چوراسی لاکھ بتیس ہزار ہے اور تین لاکھ اکتیس ہزار ایک سو قلمی کتابیں ہیں۔ اس کو ہر مطبوعہ کتاب کی ایک جلد مفت ملتی ہے۔ اس کتب خانہ کی مکمل فہرست تیار کی جا رہی ہے۔

امریکہ | امریکہ میں انیسویں صدی کے نصف تک کتب خانوں کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی مگر اس کے بعد اس طرف بہت دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ گزشتہ نصف صدی میں کتابیں جمع کرنے میں بے انتہا ترقی ہوئی اور ملک میں متعدد کتب خانے قائم ہو گئے جن میں ایک کروڑ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ واشنگٹن کے کانگریس کے کتب خانہ میں اکتالیس لاکھ کتابیں اور ایک کروڑ سے زیادہ نقشے وغیرہ ہیں۔ اس کو بھی ہر مطبوعہ کتاب کی دو جلدیں مفت ملنے کا حق حاصل ہے

واشنگٹن کا دوسرا مشہور کتب خانہ سرجن جنرل کا کتب خانہ ہے جو غالباً دنیا کے تمام طبی کتب خانوں میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اس میں سات لاکھ پچاس ہزار طب کی کتابیں ہیں۔

جرمنی | جرمنی میں سب سے اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ پروشین اسٹیٹ لائبریری ہے جو برلن میں واقع ہے۔ یہ ۱۶۵۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۶۹۹ء سے اس کو ہر مطبوعہ کتاب کی ایک جلد مفت حاصل ہوتی ہے۔ آج کل اس میں تین کروڑ مطبوعہ اور اٹھ ہزار ایک سو سینتالیس قلمی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ دو لاکھ دس ہزار متفرق مسودات و نقشہ جات وغیرہ ہیں۔

جرمنی کا دوسرا قابل ذکر کتب خانہ مونک کی بویرین اسٹیٹ لائبریری ہے جس کی بنیاد سولھویں صدی کے وسط میں رکھی گئی تھی۔ اس میں سولہ لاکھ ستر ہزار مطبوعہ، پچاس ہزار قلمی کتابیں اور سولہ ہزار کتابیں سنہ ۱۵۰۰ء سے قبل کی تصنیف کردہ ہیں۔

اٹلی | اطالیہ میں بہت سے قدیم کتب خانے ہیں، مثلاً فلارنس کا کتب خانہ لارنشین۔ وینس کا کتب خانہ لائبریری آف سینٹ مارک ۱۳۶۲ء میں قائم ہوا تھا۔ امیبروشین لائبریری (میلان) ۱۶۰۹ء میں، نیشنل لائبریری (نیپل) ۱۸۰۴ء میں قائم ہوئے تھے۔ سنٹرل نیشنل لائبریری (فلورنس) موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے اٹلی کا بہترین کتب خانہ ہے۔

لیکن اٹلی کے تمام کتب خانے ویٹیکین لائبریری کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ جو غالباً یورپ میں سب سے قدیم کتب خانہ ہے۔ یہ پاپائے روم کا ذاتی کتب خانہ ہے جس کی بنیاد پوپ نکولس پنجم نے ۱۴۴۷ء میں رکھی تھی۔ اس وقت سے اب تک اس میں برابر ترقی ہوتی رہی ہے۔ اس کی موجودہ عمارت ۱۵۸۸ء میں تیار ہوئی تھی۔ سنہ ۱۶۵۸ء میں اُربینو لائبریری اس میں شامل کردی گئی تھی۔ آج کل اس میں چار لاکھ مطبوعہ کتابیں اور سات ہزار قدیم نسخے ہیں۔ اس کی قلمی کتابوں کا ذخیرہ ترپن ہزار ہے جن میں انجیل مقدس کا یونانی زبان کا ایک قدیم نسخہ بھی ہے جو چودھویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے اور بھی بعض نادر نسخے اس کتب خانہ میں ہیں۔

اس عظیم الشان لائبریری کی ابتک کوئی فہرست تیار نہ ہوئی تھی لیکن ۱۹۲۷ء میں یہ خدمت چار اٹالین اور چار امریکن ماہرین فن کے سپرد کی گئی تھی اور ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

(ماخوذ)

تمنائے مہجور[۱]

(مترجمہ مسٹر جان محمد عاطف روڑکوی)

(۱)

اے خدا میری آنکھوں کو وہ قوت بینائی، وہ لمعات نور عطا فرما جس سے میں اپنی "محبوبۂ مرحوم" کے حسنِ معصوم کو بے نقاب دیکھ سکوں، ورنہ مجھے بھی اُسی راستہ پر چلنے کی اجازت دے جس راستے سے وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔

(۲)

پیاری محبوبہ! آہ!! تجھے نہیں معلوم کہ میں تیری جدائی میں کس کرب و بے چینی کی حالت میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہوں، کیوں؟ اس لئے کہ اب نہ تو میں تیری سحر طراز آنکھوں سے مسحور ہو سکتا ہوں نہ لبہائے معجز نما سے بہرہ اندوز، اور نہ تیرے چاہ زنخداں میں غرقاب ہو سکتا ہوں۔ ہاں! اور تیری اُن سنہری زلفوں کی دید سے بھی محروم ہو چکا ہوں جو بادِ نسیم کے سرد جھونکوں سے تیرے خوبصورت اور نرم و نازک شانوں پر منتشر ہو جایا کرتی تھیں۔

(۳)

لعبتِ حُسن و جمال! اے مجسمۂ حیا و تصویرِ وفا اور اے محبت کی پُتلی! آہ! تیری وفات حسرت آیات کے بعد اب مجھے کسی دوسری رفیقۂ حیات اور مونسِ غم کی تلاش و جستجو کی مطلق آرزو اور قطعاً ضرورت نہیں! اب بسترِ مرگ ہے اور میں۔ دل ہے اور تیرا خیال، میرے جسدِ خاکی میں میری غیر فانی روح تیری روح سے ملنے کے لئے بیچین اور بے قرار ہے! "ارواح فرشتے ہیں" روح، روح کو دیکھ سکتی ہے! مگر اس وقت جبکہ آنکھوں کی پُتلیوں کا نور زائل ہو کر اُنکو سکوت دائمی حاصل ہو جاتا ہے

(۴)

اے دنیا کے رہنے والو! ذرا خاموش رہو!! وہ آ رہی ہے۔ کون؟ موت، پیاری محبوبہ کا پیارا

---

[۱] انگلستان کے مشہور شاعر ایرک مَیکے کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ۔ (عاطف)

قاصد۔ وہ قریب ہے اور میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ میرے لئے پیغام حیات لا رہی ہے۔ اور حیات بھی کیسی؟ دائمی۔ وہ حُسن کی دیوی پیمانۂ دل میں شراب محبت بھر کر اپنے قاصد سے کہتی ہے کہ جا اور جلد جا اور اُس تشنہ کام محبت کی تشنگی کو بجھا جو مجھ سے ملنے کے لیے اپنی فانی زندگی کے آخری لمحے بستر مرگ پر نہایت بے چینی سے کاٹ رہا ہے۔

(۵)

پیارے قاصد! اے موت! آ اور جلد آ اور مجھے اس آفتاب عالمتاب سے دور عالم ارواح میں جہاں میری منظور نظر، الفت حقیقی اور حیات دائمی کے لطف اُٹھا رہی ہے لے چل۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے اور اُس منزل کا راستہ بتا جہاں میری دلربا مہمان نوازی میرے آنے کی راہ دیکھ رہی ہے۔ قاصد نے اپنی مفوضہ خدمت سے فراغت پائی اور میں یہ کہتا ہوا اُس کے ساتھ ہو لیا۔

مدت سے آسیر اُن کے ملنے کی تمنا تھی
آج اُس نے بُلایا ہے لینے کو قضا آئی

مختلف اقوام میں سلام اور مزاج پرسی کا طریقہ

(۱) امریکہ والے پوچھتے ہیں۔ آپ کا مزاج کیسا ہے؟

(۲) چین والے دریافت کرتے ہیں۔ آپ کے معدہ کا کیا حال ہے۔ کیا آپ نے اپنے چاول کھائے ہیں؟

(۳) ڈچ یعنی ملک ہالینڈ والے دریافت کرتے ہیں۔ آپ کا کیا حال ہے۔ کس طرح گذر ہو رہا ہے؟

(۴) اہل مصر میں مزاج پرسی کا یہ طریقہ ہے کہ وہ دریافت کرتے ہیں کہ آپ کو پسینہ کس طرح آتا ہے؟

(۵) عرب والے دریافت کرتے ہیں۔ تمہارا مزاج کیسا ہے؟

(۶) انگریز دریافت کرتے ہیں۔ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟

(۷) فرانس والے دریافت کرتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو کس طرح لئے جا رہے ہیں؟

(۸) جرمنی والے دریافت کرتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو کس طرح پاتے ہیں؟

(۹) اٹلی والے دریافت کرتے ہیں آپ کس طرح ایستادہ ہوتے ہیں؟

تنقید کتب

افادات مہدی

از۔ ایم۔ مہدی حسن مرحوم، رائل سائز، ۳۷۵ صفحات
قیمت ہے، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ۔

اردو خواں جماعت سے ایم۔ مہدی حسن مرحوم (افادی الاقتصادی) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ ایک مشہور انشا پرداز تھے اور اُن کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوکر مقبول عام ہو چکا ہے اب وہی مجموعہ کچھ اضافہ کے ساتھ دوبارہ چھپا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس میں تیس مضامین ہیں۔ شروع میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی، بی۔ اے کا لکھا ہوا ہے ایک مختصر دیباچہ اور مہدی بیگم (مرتب مجموعۂ ہذا) کے نزشتہ مہدی مرحوم کے سوانح حیات ہیں۔ مضامین کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ یہ مجموعہ عام طور پر مقبول ہے اور جن حضرات نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ مہدی مرحوم کی مخصوص طرز انشا سے بخوبی واقف ہیں۔

الہام منظوم

(دفتر چہارم و پنجم) کراؤن سائز۔ مجلد۔ قیمت ہر دفتر ہے۔
مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس، سرکلر روڈ۔ لاہور

یہ مثنوی مولانا روم کا اُردو منظوم ترجمہ ہے جس کے تین دفتر پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ ترجمہ قریب قریب لفظی ہے، مگر اصل منشا بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا ہے۔ فیروز پرنٹنگ ورکس نے اس منظوم ترجمہ کو شائع کرکے اُردو زبان کے سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے، اس سے پیشتر ہم الہام منظوم کے اول تین دفتروں کا ریویو شائع کر چکے ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ اب یہ بہتم بالشان ترجمہ مکمل ہوکر پانچ جلدوں میں ختم ہوگیا ہے جس پر ہم اس کے الوالعزم پبلشر فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس کی لکھائی چھپائی صاف و پسندیدہ اور جلد خوشنما ہے۔ ترجمہ کا نمونہ درج ذیل ہے۔

عاشقاں را شادمانی و غم اوست — دست مزد و اجرت خدمت ہم اوست
عاشقوں کا ہے وہی رنج اور خوشی — ان کی مزدوری و خدمت بھی وہی

غیر معشوق ار تماشائے بود عشق نبود ہرزہ سود ائے بود
غیر کو دیکھے سوا معشوق کے عشق بیہودہ ہے اُس کا جان لے
عشق آں شعلہ است کوچوں برفروخت ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
عشق وہ شعلہ ہے جب روشن ہوا ماسوا معشوق کے پھونکا جو تھا

میر عالم مؤلفہ محمد سراج الدین طالب ۔ رائل سائز ۔ ۲۳۰ صفحات ۔ قیمت ؎
ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن

سید ابو القاسم المخاطب بہ میر عالم ریاست حیدر آباد دکن کے ایک نامور وزیر گزرے ہیں۔ اس کتاب میں ان کے سوانح حیات بالتفصیل درج کئے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ریاست حیدر آباد دکن کی کس قدر خدمات انجام دیں اور ریاست کے معاملات انگریزوں کے ساتھ کس قدر حسن تدبیر سے طے کرائے۔ درحقیقت یہ کتاب صرف میر عالم کی سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ اُس زمانہ کے سیاسی واقعات کا بھی یہ ایک دلچسپ مرقع ہے، خصوصاً انگریزوں کے ساتھ جو مراسلات و معاہدات ہوئے اُن پر اس کتاب میں بڑی حد تک روشنی ڈالی گئی ہے۔ متعدد تصاویر سے بھی کتاب مزین ہے۔

حُسن کی چنگاری مرتبۂ ڈاکٹر بٹن بہادر سکسینہ ۔ کراؤن سائز ۔ ۲۱ صفحات ۔ قیمت ۲ر
ملنے کا پتہ :- آکاش بانی آفس ۔ بریلی

یہ جناب برق دہلوی، آغا حشر کاشمیری، مسٹر بیتاب بریلوی کی چند غزلیات کا مختصر مجموعہ ہے۔ غزلیات مختلف عنوانات کے تحت میں ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ حضرت امیر مینائی مرحوم کی تین غزلوں کے منتخب اشعار بھی ہیں جن کے مطالع یہ ہیں :-

گور میں تم نے جو لاشہ کو اُتارا ہوتا لے بتو خاتمہ بالخیر ہمارا ہوتا
پھڑک کر مرغ بسمل کی طرح عاشق جو مرتے ہیں یہ مقتل میں عروسِ تیغ کے صدقے اُترتے ہیں
یہ گالی جو اے دلربا مل رہی ہے دُعا دی تھی اُسکی سزا مل رہی ہے

اس مجموعہ کے سرورق پر ایک خوشنما تصویر بھی دی گئی ہے۔

مباحثہ

"ایک تنقیدی نظر"

از سیّد اعظم حسین صاحب مدیر ادب لکھنؤ

"زمانہ" ماہ جون ۳۲ء میں نقادِ زمانہ نے بعض اُردو رسالوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے، ہم جناب نقاد کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے اس سلسلہ میں "ادب" کا ذکر سب سے پہلے کیا ہے لیکن ہمیں اُن سے کچھ دوستانہ شکایت بھی ہے، اُنھوں نے "ادب" کے مئی نمبر کو تو اُٹھایا لیکن اس میں سے صرف حضرت آرزو مدظلہ کے کلام کو چن لیا اور اُسی سے بحث کی، دوسرے مضامین کا قطعاً ذکر نہ کیا۔ ہم لتنے پر بھی خوش رہتے اگر جناب نقاد نے اس نقد کے دوران میں شاعر بزرگ کے کلام کے بہترین حصہ پر روشنی ڈالی ہوتی لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا جس سے غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ ہے اس لئے اُن کے اعتراضات کے جوابات لکھے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ انھیں دیکھ لینے کے بعد ناظرینِ زمانہ اور خود جناب نقاد غلط فہمی سے بچ کر شاعر بزرگ کے کلام کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع پا سکیں گے۔

حضرت آرزو کا مطلع ہے ؎

تپتے بن میں رہے پیاسے تو یہ سوکھا پانی   بیچ روئے بھی تو آنکھوں سے نہ نکلا پانی

جناب نقاد فرماتے ہیں "اس مطلع کے قوافی میں ایطا ہے" درانحالیکہ ایطا نہیں ہے۔ اُردو میں امر کے جتنے ایسے صیغے ہیں جو انفراداً صلاحیت استعمال نہیں رکھتے وہ مہمل سمجھے جاتے ہیں اُن سے الف ماضی الگ نہیں کیا جا سکتا ہے اور قائم مقام اصلی مانا جاتا ہے۔ اس صورت میں صرف روی کا ایک جگہ اصلی یا قائم مقام اصلی ہونا کافی ہے۔ "سوکھا" اسی قبیل سے ہے۔ یہ بحث اکثر چھڑ چکی ہے اور مسکت جوابات دیے جا چکے ہیں۔ اسی طرح کے قافیے حضرت امیر مینائی اور حضرت جلال کے یہاں اکثر جگہ موجود ہیں اور دوسرے شعراء کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

اسی شعر سے متعلق جناب نقاد کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پہلے مصرع میں "پانی" کا مفہوم واضح

نہیں ہوتا درانحالیکہ اس مصرع میں پانی سے مراد وہ رطوبات ہیں جو آنکھ میں آکر آنسو بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب تپتے ہوئے بن کی تپش نے ان رطوبات ہی کو خشک کر دیا جو آنسو بنکے نکلتے ہیں تو آنسو کہاں سے نکلیں۔ یہاں مینھ اور پسینے کے ذکر کا کیا موقع ہے۔ قرینہ جو معنی دیتا ہے وہی لئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد جناب نقاد نے اس شعر پر اعتراض کئے ہیں ؎

بے لسبی دیکھ کے عباس کا جی بیٹھ گیا
پیاسی بچی نے جو منھ پھوڑ کے مانگا پانی

اُن کے خیال میں یہاں جی بیٹھ جانا بے محل ہے، جی بھر آنا اس سے بہتر اور برمحل ہے۔ جی بھر آنا اس موقع پر مناسبت ظاہری میں بہتر ضرور معلوم ہوتا ہے اور ہم اسے بھی پسند کرتے ہیں مگر جی بیٹھ جانے کو اس جگہ بے محل کہنا مناسب نہیں۔ جناب نقاد نے جی بیٹھنے کی دو علتیں خود بیان کی ہیں ۱۔ ضعف ۲۔ مایوسی ضعف کو تین روز کی بھوک پیاس واضح کر رہی ہے اور مایوسی کو امام سے اجازت نہ ملنے کی بے لسبی ایسے عالم میں لاڈلی بھتیجی کی حسرت بھری درخواست سُنکر حضرت عباس کی جو فوری حالت ہوئی ہوگی وہ جی بیٹھ جانے کے علاوہ اور کن لفظوں میں ظاہر کی جاسکتی ہے۔ اس وقتی کیفیت کے اظہار سے حضرت عباس کی شجاعت پر حرف نہیں آتا۔ جب اسی پانی لانے کی استدعا پر اجازت مل گئی تو جو کچھ ہمت وشجاعت حضرت کے شایانِ شان تھی اُسے شاعر بزرگ نے آگے چل کر دکھا دیا ہے۔ مسلسل نظم کے صرف ایک شعر سے نتیجہ نکالنا صحیح نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے بحیثیت مجموعی کہاں تک کامیاب ہے۔ یہاں شاعر نے اپنا موضوع "پیاسے ساونت کی لڑائی" قرار دیا ہے، محض "ساونت کی لڑائی نہیں" ایسی صورت میں تشنگی اور اس کے متعلقات کے اثرات کا اظہار دلیری کے منافی نہیں ہے بلکہ نہایت ضروری ہے۔ البتہ قابل اعتراض وہ محل ہوتا جب شاعر ان اثرات کو اس طرح پائدار ثابت کر دیتا کہ پھر پیاسے ساونت سے شجاعت ظاہر نہ ہوتی۔ لیکن یہاں شاعر نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے دکھایا ہے کہ اس وقتی اضمحلال قلب کا ردِ عمل فوراً ہوا اور بہت سخت ہوا۔ پیاسی بچی کی حالت کے مشاہدے نے گویا سمندِ ناز پر ایک تازیانہ کا کام کیا۔ شیر بیشۂ شجاعت غیظ میں آیا اور جہاد نہیں صرف پانی لانے کی اجازت پر ایسی تلوار کہ مخالفین کا ٹڈی دل لشکر تر بتر ہو گیا۔ ان تمام باتوں کی موجودگی میں شاعر پر یہ اعتراض کیونکر کیا جاسکتا ہے کہ اس نے غازی کو بزدل بنا دیا

اسی شعر کے دوسرے مصرع پر اعتراض ہے کہ یہاں منھ پھوڑ کے مانگنا درست نہیں ہے۔ درانحالیکہ منھ پھوڑ کے مانگنے کے معنی ہیں "مانگنے کی عادت نہ ہونے کے باوجود مانگ بیٹھنا" یہاں خلاف عادت

کرنے کی قوی وجہ ظاہر ہے۔ تین دن کی پیاس ناقابل برداشت ہو رہی تھی، ایسی حالت میں ایک شفیق بزرگ سامنے آگیا۔ اگرچہ خاندانی تہذیب اور قحط آب کا علم مانع لب کشائی تھا لیکن پیاس کی شدت نے منھ کھلوا ہی دیا اور حالتِ اضطرار میں حضرت سکینہ پانی مانگ ہی بیٹھیں۔

جناب نقاد نے اس مصرع کو یوں صحیح کیا ہے ع "منھ پہ منھ رکھ کے سکینہ نے جو مانگا پانی" اس تبدیلی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباس خیمے میں کسی جگہ اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے اُن سے یہ تین برس کی بچی لپٹی ہوئی تھی اور لاڈ پیار ہو رہا تھا۔ درانحالیکہ یہ واقعہ نہیں ہے، وہاں تو ایک قیامت برپا تھی، میدانِ قتال گرم تھا، انصار و اعزہ جُدا ہو رہے تھے، لاشوں پر لاشیں آ رہی تھیں۔ حضرت عباس کا ساجری یہ تمام خون آشامیاں دیکھ رہا تھا۔ میدان کی اجازت نہیں مل رہی تھی اور اُس کا خون کھول رہا تھا، ایسے موقع پر "منھ پہ منھ رکھنا" کہاں تک مطابق فطرت ہے؟

تیسرا شعر جس پر اعتراض ہوا ہے یہ ہے ؎

اس لڑائی میں یہی جیت کی اک کُنجی ہے مرتے مرتے کسی پیاسے کو نہ دینا پانی

جناب نقاد نے "کی اک کنجی" میں تین کافوں کا اجتماع معلوم نہیں کس قاعدے سے غلط یا غیر فصیح قرار دیا ہے، تنافر بھی اس وقت کہا جا سکتا تھا جب مصرع کے پڑھنے میں زبان اُلجھتی۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف موصوف نے اس میں تبدیلی نہیں کی ورنہ "جیت کی ہے اک کنجی" یا "جیت کی اک ہے کنجی" کہنے میں حروف کی یکجائی نہ رہتی اور خالص اُردو کی قید بھی نہ ٹوٹتی۔ جناب نقاد نے اصلاح کی ہے "فتح کی اک صورت ہے" لیکن اس اصلاح سے دو دو لفظ عربی کے آ گئے اور اس تصرف نے مصنف کو اس کے مسلک ہی سے ہٹا دیا۔ اگر یہ مصرع مصنف کی رائے میں فصیح نہ ہوتا تو وہ اسے "خالص اُردو" کی قید کے ساتھ متعدد طرح کہہ سکتے تھے۔ مثلاً "جیتنا ہے یہ لڑائی تو ابھی سے سُن لو"۔ "جیت اپنی ہے اسی میں کہ لہو تک بہہ جائے" وغیرہ وغیرہ بیسیوں مصرعے ہو سکتے تھے لیکن مصرع پر ایک ہی مصرع لگایا جا سکتا ہے۔ جناب نقاد نے دوسرے مصرع میں بھی تبدیلی کی ہے۔ اس تبدیلی نے اس مصرع کے زور کو بھی خاک میں ملا دیا ہے، کہاں یہ شان کہ ایک دوسرے سے کہہ رہا ہے "مرتے مرتے کسی پیاسے کو نہ دینا پانی" اور کہاں یہ خیال کہ "مرتے مرتے بھی نہ پائے کوئی پیاسا پانی"۔

چوتھا شعر جو معرضِ بحث میں ہے یہ ہے ؎

گھات سے ہاتھ چلیں ایسی منچی چوٹوں کے مانگتا ہی نہ ہو جن چوٹوں کا مارا پانی

جناب نقاد فرماتے ہیں کہ یہاں ہاتھ اور چوٹ دونوں میں سے ایک حشو ہے۔ فنِ سپہگری اور اس کے

مصطلحات پر عبور رکھنے والے جانتے ہیں کہ پالٹ، جنیٔو، طمانچہ وغیرہ اُن مقامات کا نام ہے جن پر وار کرنے کی مشق کی جاتی ہے اور چوٹ کا اطلاق ہمیشہ اس جگہ کے لحاظ سے ہوتا ہے جو زد میں ہوتی ہے۔ (اسی لئے کہتے ہیں سر کی چوٹ، کمر کی چوٹ) لہٰذا "منجی چوٹ" کا مفہوم ہوا وہ تکی ہوئی جگہ جس پر ہاتھ ایسا صاف ہے کہ خالی نہیں جاتا۔" اس مصرع سے "گھات سے ہاتھ چلیں ایسی منجی چوٹوں کے" مطلب یہ ہے کہ ایسے ہاتھ چلیں (وار چلیں) جو تکی ہوئی جگہوں میں مشق سے صاف ہو چکے ہیں۔ صرف "چوٹیں چلنے" کے معنی "ردو بدل" کے ہیں اور صرف "ہاتھ چلنے" میں "ضرب" کا مفہوم نہیں ادا ہوتا۔ اگر ہو سکتا تو جناب نقاد اپنی عادت کے موافق اس مصرع میں بھی اصلاح فرماتے۔

پانچواں شعر جس کی تنقید کی گئی یہ ہے ؎

بیدھڑک باگیں اُٹھادیں جو یہ کہکر سب نے — دیکھا اب سر سے ہوا جاتا ہے اونچا پانی

اس پر اعتراض ہے کہ دوسرے مصرع میں لفظ "دیکھا" کا فاعل مقدر ہے اور باعتبار محاسنِ شعر عیب یا کمزوری ہے، توضیح و تشریح کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب غلط فہمی کا اندیشہ ہو، یہاں وہ اندیشہ نہیں تھا۔ ایسے کس کی عقل پر پتھر پڑے ہیں جو قرینہ دیکھ کے بھی نہ سمجھے کہ پانی کس کے سر سے اونچا ہوا جاتا ہے۔ مخاصمین سامنے ہیں، ایک نے حملے کی ابتدا کی تو حملے سے حضرت کا اندیشہ کس کے دل میں پیدا ہوگا۔ یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جو اتنا بھی نہ سمجھے وہ کیا سمجھ سکتا ہے۔ یہاں فاعل کا مقدر ہونا عین بلاغت ہے جس کے راز کو جناب نقاد نے شعر میں تبدیلیاں کر کے خود ظاہر کر دیا ہے، ملاحظہ ہو ؎

باگیں اک ساتھ اُٹھادیں جو یہ کہکر سب نے — دیکھا غازی (عباس) نے کہ سر سے ہوا اونچا پانی

"بیدھڑک باگیں اُٹھادیں" اور "اک ساتھ باگیں اُٹھادیں" کا فرق اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں "اک ساتھ باگیں اٹھادیں" آرزو کی اردو تو نہیں ہو سکتی دوسرے مصرع کے پہلے تصرف نے لفظ غازی استعمال کر کے ایک تو خالص اردو کو داغدار اور دوسرا بنا دوسرے مصرع کو پھُسپھُسا کر دیا۔ کہاں "پانی سر سے اونچا ہوا جاتا ہے" اور کہاں "پانی سر سے ہوا اونچا" مصرع کا زور بھی گھٹا اور تعقید معیوب بھی ظاہر ہوئی۔ اور دوسرے تصرف میں "عباس" لانے سے قید تو نہیں ٹوٹی لیکن مصرع اور بھی بجھ کے رہ گیا۔

چھٹا شعر جس پر اعتراضات وارد کئے گئے ہیں ؎

بل پڑے تیوریوں پر ہو گئی چتون کچھ اور — تمتمانے لگا منھ ماتھے سے ٹپکا پانی

کتابت کی غلطی سے "تیوریوں" کی جگہ "تیوروں" چھپ گیا۔ جناب نقاد نے اسے مصنف کی غلطی

قرار دیدی۔ ایسی لغزش کسی ادنیٰ ترین اہل زبان سے بھی ممکن نہیں چہ جائیکہ اس شخص سے جس کی زبان دانی طبقۂ اعلیٰ میں مسلم ہے۔ ہمارے پاس نظم کا مسودہ موجود ہے۔ اگر جناب نقاد کو یوں اعتبار نہ ہو تو ہم اُنھیں دکھا سکتے ہیں۔

دوسرے مصرع میں ماتھے سے پانی ٹپکنے پر اعتراض ہے، ماتھے سے پانی ٹپکنا جہاں شرم وسکرات کی علامت ہے وہاں گرمی بھی اس کا سبب ہوتی ہے۔ میدان کی دھوپ اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے آنا محتاج تشریح نہیں۔ پسینے کی علت غصہ کو قرار دینا جناب نقاد کا انتقالِ ذہنی "منھ تمتانے" کی بنا پر ہے ورنہ ہے یہ کہ پسینہ شدت حرارت سے موجود تھا۔ غصہ میں چہرے کے آثار چڑھاؤ سے حرکت پیدا ہوئی اور اُس نے پسینے کو ٹپکا دیا۔ دو کیفیتوں کی دو علتیں بھی موجود ہیں، یہ واقعہ نگاری ہے غزل کا شعر نہیں کہ خیال کا دائرہ محدود ہو۔

"خالص اردو" کا آخری شعر جس پر اعتراض کئے گئے یہ ہے سے

آرزو ڈوب کے جب تھاہ لگائے تو کھلے   اتھلی ندی میں نہ ہونے یہ ہے کتنا پانی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ "تھاہ لگانا محاورہ" نہیں ہے "تھاہ لینا" ہے۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے لکھنؤ میں یہ محاورہ دونوں طرح ہے، معلوم نہیں جناب نقاد نے کس اسکول کو مدّنظر رکھکر یہ اعتراض کیا ہے۔

دوسرا اعتراض کیا ہے اچھا خاصہ مذاق ہے۔ جناب نقاد کے نزدیک اتھلی ندی میں غوطہ لگانے سے کیچڑ میں لت پت ہونا پڑتا ہے اور خذف ریزے ملتے ہیں اور بحر زخار میں غوطہ لگانے سے دُرِ شاہوار ہاتھ آتے ہیں، مراد اس سے یہ ہے کہ "خالص اُردو" کی قید کیوں اختیار کی، لیکن یہ عجیب منطق ہے، اس کی بنا پر تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شعر ہی کیوں کہا، نثر میں ہر مطلب بآسانی ادا ہو سکتا ہے۔

جناب آرزو نے خالص اُردو کی قید اختیار کر کے اس صفائی سے طرح طرح کے خیالات ادا کئے ہیں کہ اگر ظاہر نہ کر دیا جاتا تو سمجھنا ہی دشوار تھا کہ کوئی خاص پابندی اختیار کی گئی ہے۔ انھوں نے جن جن لفظوں کو حسن استعمال سے فصاحت و بلاغت کی جان بنا دیا ہے ان لفظوں سے آج سیکڑوں بے خبر ہیں اور جو جانتے ہیں ان میں سے اکثر ان کے استعمال میں دقت محسوس کرتے ہیں حضرت آرزو کی اس قادر الکلامی کو دنیا مان چکی ہے۔ افسوس ہے کہ جناب نقاد اس کا اندازہ نہ کر سکے۔ آپ "خالص اُردو" کے متعلق آخر میں لکھتے ہیں "چند متروک الفاظ یا عامیانہ محاورات و اصطلاحات کو نظم کر دینا کوئی خدمتِ زبان نہیں ہے۔" ہم اس کا جواب تفصیل سے دیتے لیکن مشکل

یہ ہے کہ جناب نقاد کے بیان ہی میں اختلاف ہے۔ آپ نے شروع میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قول کی بالکل ضد ہے۔ ابتدائے مضمون میں آپ لکھتے ہیں "جناب آرزو خالص اُردو کی ترویج کے حامی ہیں اور یہ وہ مقصد ہے جس سے ہر بہی خواہ اُردو کو ہمدردی ہوگی" جناب نقاد کو بہی خواہ اُردو مانتے ہوئے یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ اُن کا کونسا خیال صحیح ہے۔ اس لئے اب غیر مقید کلام کے اعتراضات کے متعلق کچھ عرض کرکے مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

جناب نقاد فرماتے ہیں کہ "اسی نمبر میں جناب آرزو کی ایک غزل اور چند رُباعیاں بھی شائع ہوئی ہیں۔ غزل میں دو تین اشعار ایسے ہیں کہ اگرچہ ان میں کوئی خاص بات تو نہیں تاہم غنیمت ہیں مگر باقی اشعار شک وشبہ سے خالی نظر نہیں آتے۔" 'ادب' کے معرض بحث نمبر میں کوئی غزل شائع نہیں ہوئی ہے۔ ایام عزا کے لحاظ سے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔ البتہ اس میں حضرت آرزو کی ایک نظم شائع ہوئی ہے، جسے جناب نقاد نے اپنی طرف سے غزل لکھکر اعتراضات شروع کردئے ہیں، ظاہر ہے کہ حیب النساں ہاتھی کو گھوڑا۔ طاؤس کو عنقا سمجھکر ان پر خیال آرائی کریگا تو کہاں تک نہ بہکے گا۔ نظم پر لفظ غزل تحریر بھی نہیں ہے اور اس کے بعض اشعار صاف صاف بتارہے ہیں کہ یہ غزل نہیں ہے نظم ہے اور وہ بھی واقعات کربلا سے متعلق ہماری فروگذاشت اتنی ضرور ہے کہ ہم نے جلدی میں اس غیر معمولی نظم پر نوٹ نہیں لکھا، لیکن وہ نوٹ صرف عوام کے سمجھانے کے لئے ہوتا۔ مبصرین کے لئے تو اتنے قرائن موجود ہیں کہ کسی خاص اشارہ کی ضرورت نہیں۔ اس نظم کے تین شعروں پر اعتراضات کئے گئے ہیں، پہلا شعر یہ ہے ؎

کتنے آئے ہیں یہ اک بیمارِ غم سے کُل مریض
کر تھکے سب کچھ مسیحا اور شفا ہوتی نہیں

یہاں بیمارِ غم سے مراد ذات حضرت سجاد ہے۔ اور کل مریض سے مراد مریضانِ عصیاں، گنہگارانِ امت ہیں، تعلق اس شعر کے مفہوم کا عقائد اہل تشیع سے ہے۔ غزل کا شعر مان لیا جائے تو کیونکر سمجھ میں آئے۔

دوسرا شعر ؎

بے مرے زندہ نہ ہونگی یہ سسکتی حسرتیں
انتہا جب تک نہ ہولے ابتدا ہوتی نہیں

اس کے متعلق جناب نقاد فرماتے ہیں کہ "عجیب نظریہ ہے، مرنے کے بعد کس کا زندہ ہونا ممکن ہے۔" لیکن ہمیں اس میں کوئی بات قابل تعجب نہیں معلوم ہوتی۔ انبیا و اولیا نے حکم خدا سے ہزاروں مرے زندہ کئے ہیں، ہر بہار خزاں کے بعد آتی ہے، ہر صبح رات تمام ہونے کے بعد ہوتی ہے، ہزاروں امیدیں کامل مایوسی کے بعد پھر پیدا ہوتی ہیں۔

تیسرا شعر ؎

کیا کرامت ہے ترے بیمارِ غم کی زندگی ضعف سے نوبت بجاں ہے اور غذا ہوتی نہیں

اس شعر میں جناب نقاد نے "غذا ہونے" کو خاص اصطلاح بتایا ہے۔ جس کا تعلق اطبا و مرضا تک محدود ہے۔ اور پھر یہ اعتراض فرمایا ہے کہ مخصوص اصطلاح کو اُردو ادبیات میں کیوں داخل کیا گیا معلوم نہیں جناب نقاد نے یہ اعتراض کیونکر کردیا۔ بیمار کے ذکر میں بھی اگر اطبا و مرضا کی مخصوص اصطلاح نہ استعمال کی جائے تو پھر اس کے استعمال کا اور کونسا محل ہوگا۔ زبان کے مخصوص مصطلحات و محاورات کا برمحل استعمال وہ شخص ضرور کریگا جو ان پر عبور رکھتا ہے، یہ کیا زبردستی ہے کہ تیر کا پلہ۔ تلوار کا گھاٹ کمان کا چلہ، جنگی اصطلاحیں ہیں اس لئے لڑائی کے ذکر میں انھیں استعمال نہ کیا جائے!

رباعیوں میں سے ذیل کی رباعی پر اعتراض ہے ؎

پہلے سوچ، اہتمام کر اس کے بعد تا پھر نہ ہو خواہش دگر اس کے بعد
فانی دنیا کی ہے ہر شے فانی چاہا جو کچھ ہوا، مگر اس کے بعد

اس رباعی کا چوتھا مصرع جناب نقاد کے نزدیک پیچیدہ و بے ربط ہے۔ جس کی وجہ سے اُن پر رباعی کا مطلب واضح نہیں ہوا، لیکن ہمیں اس میں کوئی پیچیدگی اور بے ربطی نہیں معلوم ہوتی بلکہ وہ سلاست و تسلسل نظر آتا ہے جس سے زبان پر غیر معمولی قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ آخری مصرع کا دوسرا ٹکڑا (مگر اس کے بعد؟) ایسا سوالیہ فقرہ ہے جو حسنِ بیان کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے شاعر صاف صاف کہہ رہا ہے کہ جب دنیا اور اُس کی ہر شے فانی ہے تو پھر اسے طلب کرنے سے فائدہ؟ اگر تمہارے حسبِ طلب فانی چیز مل بھی گئی تو وہ تمہارے پاس کب تک رہ سکتی ہے۔ اس کا تو ملنا اور نہ ملنا دونوں برابر ہے۔ لہٰذا جو کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرو وہ باقی ہو فانی نہو یہ رباعی تو قابلِ تعریف ہے، قابلِ مذمت کیونکر ٹھہری؟ جناب نقاد سے استدعا ہے کہ حضرت آرزو کے کلام کو وہ ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں۔

آخر میں ناظرینِ "زمانہ" کے ملاحظہ کیلئے حضرت آرزو کی اُسی نظم کے چند شعر پیش کرتا ہوں جس کے ایک حصے کو جناب نقاد نے تنقید کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔

جنگ جوئی مایۂ صبر و رضا ہوتی نہیں ہر زمیں بننے سے مقتل کربلا ہوتی نہیں
درد کا کیا ذکر جو گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے دیکھنا یہ ہے کہ بےچینی سوا ہوتی نہیں
زیرِ خنجر بندھتی ہے نیت ادائے فرض کی یہ نمازِ عاشقی ہے جو قضا ہوتی نہیں
اُف رے پاسِ نازِ بیداری گلا کٹنا قبول دُور ہو سر سے مصیبت یہ دعا ہوتی نہیں
اُس سے سیکھی پائندگی دنیا نے غرض جو دکھ اُٹھائے خاکِ حسرت آرزو خاکِ شفا ہوتی نہیں

یادِ ایام

(از جناب جوشؔ ملیح آبادی)

ہنوز یاد ہے وہ رنگِ اضطراب ترا — بھرا تھا درد کے نغموں سے جیبِ باب ترا
عجیب دور تھا وہ دور بھی جب او ظالم — لباسِ عشق میں تھا حسن لاجواب ترا
جو شب کو روپ میں پروانے کے تھی شمع تری — سحر کو بھیس میں بلبل کے تھا گلاب ترا
وہ تیری پہلی ملاقات کی روپہلی رات — اُدھر تھا چاند، اِدھر دیدۂ پُر آب ترا
کبھی خدا کی مشیت پہ برہمی تیری — کبھی خود اپنی تمناؤں پر عتاب ترا
وہ میری بزمِ محبت وہ تیری شمعِ جمال — وہ دامِ ذرۂ خاکی میں آفتاب ترا
وہ ماہتاب کے طوفاں میں اُلجھنیں تیری — وہ ابر و باد کی ہلچل میں اضطراب ترا
وہ ابتدائے محبت کی تُند راتوں میں — بساطِ غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا
وہ آنسوؤں کے دُھندلکے میں چشمِ ناز تری — وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرشِ خواب ترا
ہر ایک بات میں چھالا سا وہ تپک اُٹھنا — نظر جھکا کے وہ لہجہ دمِ خطاب ترا
وہ تیری زلف کے خم سے مری پریشانی — وہ اپنی سانس کی خوشبو پہ پیچ و تاب ترا
وہ اضطراب کا روندا ہوا سکون مرا — وہ ولولوں کا ستایا ہوا حجاب ترا
مژہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال — وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

نہ پوچھ جوشؔ سے دونوں میں کون بہتر تھا
وہ التفات ترا، یا یہ اجتناب ترا

سایۂ ابر

باغ پر ہیں جُھکے ہوئے بادل — بو ہے جھونکوں میں سرد پانی کی
کُنج پر چھائی ہے وہ کیفیت — نیند جیسے ہو نوجوانی کی

آنسو

(از مسٹر گورسرن لال آدیب، بی۔ اے، لکھنوی)

دل سے اَب مَیں دُور ہوں مجھ سے مرا دل دُور ہے
رونقِ محفل تھا مَیں اب مجھ سے محفل دُور ہے

آنکھ میں ٹھہرا ہوں لیکن میری منزل دُور ہے
قطرۂ بر خار افتادہ ہوں ساحل دُور ہے

ساز و ساماں کچھ نہیں جُز خانہ بربادی مرا
چند لمحے کو مکاں ہے چشمِ فریادی مرا

گو کہ ہوں خاموش لیکن کیوں کرے کوئی سوال
میری صورت پر لکھا ہے میرے دردِ دل کا حال

دیکھکر مجھکو ہر اک کے دل کو ہوتا ہے ملال
زندگی میری ہے میرے واسطے خود ہی وبال

اہلِ دل ہوتے ہیں مجھکو دیکھ کر اندوہگیں
دل میں کہتے ہیں کہ پاسِ آبرو اس کو نہیں

دل جو تھا پہلے کبھی اپنا اب اپنا دل نہیں
آشنائے بحرِ غم ہوں اور کوئی ساحل نہیں

ہائے وہ رہرو ہوں میں جس کی کوئی منزل نہیں
دل پہ سب کے بار ہوں اب زیست کے قابل نہیں

ہو خوشی جس سے کسی کو وہ مری ہستی نہیں
ساغرِ لبریز ہوں وہ جس میں کچھ مستی نہیں

مَیں نے نادانی سے رازِ عشق افشا کر دیا
خود بھی رُسوا ہو گیا دل کو بھی رُسوا کر دیا

اپنے ہاتھوں آپ ہی خونِ تمنا کر دیا
اب کفِ افسوس ملتا ہوں کہ یہ کیا کر دیا

قطرۂ ناچیز ہوں اور ایک دریا دل میں ہے
کیا کہوں کس سے کہوں کیونکر کہوں کیا دل میں ہے

نوائے محوی

(از مولوی محوی صدیقی لکھنوی)

کوئی محفل ہو، فدائے شمع ہر پروانہ ہے — کیا جنونِ عشق ہے، کیا جرأتِ رندانہ ہے
کچھ وہی لذت شناسِ جلوۂ جانانہ ہے — کائناتِ دو جہاں سے جو نظر بیگانہ ہے
فیضِ فطرت عام ہے ہو حوصلہ اور ظرف بھی — نعمتِ عرفاں سے زاہد آج بھی بیگانہ ہے
ہیں پرستارِ محبت ہی یہاں رسوائے خلق — حُسن کی تاثیر سے دنیا مگر بیگانہ ہے
ہوگئی برباد کتنے بے کسوں کی زندگی — وقفِ مشقِ ناز ابھی تک نرگسِ مستانہ ہے
شمع سے سیکھے کوئی جل جل کے گھُلنا عشق میں — جلکے مر جانا بھی کوئی ہمتِ مردانہ ہے
ہے کوئی مدہوشِ عشرت، ہے کوئی سرشارِ غم — یہ تماشا گاہِ دنیا بھی عجب میخانہ ہے
طور کی سو بجلیاں اُس دل کی قسمت پر نثار — جو ترا جلوت کدہ، جو تیرا خلوت خانہ ہے
مدتوں جو زینتِ بازار رسوائی رہا — عشق کا افسانہ ہے یا حسن کا افسانہ ہے؟
عشق کی دشوار منزل، ہو اگر ہے جاں گسل — ہمقدم راہِ وفا میں ہمتِ مردانہ ہے
شکوۂ بے التفاتی اور نگاہِ ناز سے! — بارگاہِ حسن میں یہ عزم گستاخانہ ہے
بیکسی و یاس کا بھی جی نہیں لگتا جہاں — وہ مرا ویرانۂ دل، وہ مرا غم خانہ ہے
کوئی پوچھے اُن سے حاصل ہے جنھیں معراجِ عشق — یہ دلِ دیوانہ، دیوانہ ہے یا فرزانہ ہے
کیا کروں ساقی! پیا جاتا نہیں اک گھونٹ بھی — دل میں یادِ یار ہے گو ہاتھ میں پیمانہ ہے
بزم میں دیکھیں تو کس کو آج ہے دعوائے ہوش — بے تکلف التفاتِ نرگسِ مستانہ ہے
دورِ عشرت کی تمنائیں ہوں کیونکر دل سے دُور — اِن بتوں ہی سے تو یارب زینتِ بتخانہ ہے
اپنی بربادی پہ دو آنسو بہا لوں، کیا مجال! — ناشکیبائی بھی ننگِ ہمتِ مردانہ ہے
میری اُمیدیں بھی اب مجھ سے چُرا جاتی ہیں آنکھ — یہ بھی کیا تعلیم تیری عشوۂ جانانہ ہے
جو بلا آتی ہے محوی ڈھونڈتی ہے گھر مرا — اس دلِ ایذا طلب سے غم کا دو یارانہ ہے

ہنگامۂ کانپور

(از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی)

مارچ سنہ اکتیس کی چوبیسویں تاریخ بھی آہ کتنی نحس تھی تیرے لئے اے کانپور!
ہر طرف اک فتنہ تھا، ہر سمت اک ہنگامہ تھا یعنی تجھ میں ہو گیا تھا روزِ محشر کا ظہور
ہندو و مسلم ہم یوں مائلِ پیکار تھے جس پہ نفریں کر رہی تھی ہر نفس طبعِ غیور
مرد تو مرد ، آہ لبیا ہو رہا تھا ان دنوں عورتوں بچوں کے حق میں بھی مصائب کا صدور
کتنی مشتق سرد مہری تھی کہ جس کی یاد سے دمبدم سکتے میں آجاتا ہے قلبِ ناصبور
آہ وہ قتل اور وہ غارتگری کی کوششیں آہ وہ آتش زنی کے بھی مساعی کا وفور
مندر و مسجد پہ وہ ناپاک حملے بار بار اور مکانوں کا بھی وہ ڈھا ڈھا کے کرنا چور چور
نالہ و شیون کی وہ پیہم صدائے دل خراش جس کے آگے دفعتاً دب کر رہے شورِ نشور
کس قدر انسانیت سے تھا بشر کو احتراز کس قدر حیوانیت سے اسکو ملتا تھا سرور

پھر غضب ہے یہ کہ تھا جو کچھ وہ مذہب کے لئے
تھا جو کچھ وہ نام پر تیرے ہی اے ربِّ غفور!

اپنی بربادی سے لے اب درسِ عبرت بھی ذرا اپنی آبادی پہ تو اے شہر، تھا تجھ کو غرور
اپنے اشکوں سے ذرا دھو کر بہا او بدنصیب یہ نمایاں ہیں جو تیری لوح پر خونیں سطور
شرم کر اس پر کہ تو بنکر رہا کتنا اچھوت جبکہ تیری چھوت پھیلی ملک بھر میں دور دور
یہ نہ سوچ اصلا کہ تھی حکام کی ساری خطا پھر بھی تھا سب سے زیادہ آہ تیرا ہی قصور
تھے حکومت کا جو تفریق آفریں طرزِ عمل ہندو و مسلم کو حیف اس سے نہ کچھ آیا شعور
جبکہ دونوں کو ہم رہنا ہی ہے اس ملک میں کب مناسب ہے انھیں رہنا ہم ہو کر نفور
کچھ انھیں واجب ہے دینا تعلق کا لحاظ اور ہے کچھ ہمسائیگی کا پاس بھی ہونا ضرور
ورنہ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ کر دے گی فنا آخرش دونوں کو ان کی رغبتِ فسق و فجور
دین و دنیا کا مٹانا ہے عمل کرنا مدام نشۂ خمرِ تعصب سے سراپا ہو کے چور
دیکھیں کب تک سحر اپنی شومیِ تقدیر سے قائم ان دونوں کا رہتا ہے یہی عقلی فتور
دیکھیں کب تک رہتی ہے یہ بند شوخی تیرگی دیکھیں کب کھلائی دینے کو ہے آزادی کا نور

لطفِ سخن

(جناب برق دہلوی)

لذتِ گویائی مستور خاموشی میں ہے ایک محویت کا عالم خود فراموشی میں ہے

پوچھ رندوں سے اسے زاہد یہ مینوشی میں ہے مستیٔ وجد آفریں کا لطف مدہوشی میں ہے

کھیل قسمت کے زمانے کی دورنگی دیکھئے کوئی صرفِ غم ہے، کوئی شغلِ مینوشی میں ہے

خود حجابوں سے نہاں ہے اور جلوے بے حجاب حسنِ مطلق! تیری روپوشی بھی روپوشی میں ہے

مبتلائے یاس کیوں ہے اے دلِ عصیاں شعار رحمت نعفا خود فکرِ خطا پوشی میں ہے

زندگی کی کشمکش کا راز و مفہومِ سکوں دن کے ہنگاموں میں ہے، راتوں کی خاموشی میں ہے

شاہدِ معنی تصور میں بھی آسکتا نہیں، ایک عالم ہے کہ ارمان ہم آغوشی میں ہے

حسرت آلودہ نگاہیں لب پہ ہے مہرِ سکوت برق دردِ عشق کی تصویر خاموشی میں ہے

(قاضی اختر جوناگڈھی)

نکلے وہ بزمِ ناز سے منہ اپنا پھیر کر گردن پہ اپنی خونِ تمنا لئے ہوئے

آغازِ عشق سے ہوئی اپنی نمود و بود آئے ازل سے ہم دلِ شیدا لئے ہوئے

یہ دل جلوں کی آہِ شرربار کا اثر ہے داغ دل پہ لالۂ صحرا لئے ہوئے

موسیٰ کی طرح محوِ نظارہ ہوں میں ادھر وہ ناز سے ادھر یدِ بیضا لئے ہوئے

ایمن کی وادیوں میں ابھی ہے شرارِ برق آئے تو کوئی شوقِ تماشا لئے ہوئے

اسرارِ کائنات کو اختر وہ پا سکے آئے یہاں جو دیدۂ بینا لئے ہوئے

(جناب منور لکھنوی)

تو اگر محوِ صدائے جرسِ دل ہو جائے نہیں ممکن کہ پھر آوارۂ منزل ہو جائے

جو مری بزم ہے وہ ان کی ہی محفل ہو جائے بیٹھیں اس طرح کہ اٹھنا ہمیں مشکل ہو جائے

شعلۂ غم سے اگر خاک مرا دل ہو جائے — سرمۂ طور کا رتبہ اُسے حاصل ہو جائے
ہوشمندوں کے لئے قید سزاوار نہیں — جو ہو دیوانہ وہ پابند سلاسل ہو جائے
میرا دل آپکا ہے اور رہے گا لیکن — آپ اپنا جسے کہتے ہیں مرا دل ہو جائے
شعر کہتے ہو تو محتاط منور رہنا — وہ ہنر ہی نہیں جو عیب میں داخل ہو جائے

منتخبات

سو حسرتیں لئے دلِ حسرت مآب میں — آباد ہو رہا ہوں جہانِ خراب میں
ہر روز آدمی کو جہانِ خراب میں — انجام زندگی نظر آتا ہے خواب میں
اب سیرِ گل کہاں دلِ رنگیں نظر کہاں — اک خواب تھا جو دیکھ لیا تھا شباب میں
دیکھو شعاعِ حسن کی یہ جلوہ ریزیاں — یوں ہیں نقاب میں کہ نہیں وہ نقاب میں

(احسن مارہروی)

ملتا رہا سکوں کا مزا اضطراب میں — یادش بخیر وقت جو گزرا شباب میں
منزل بھی پیچھے رہ گئی ساتھی بھی چھٹ گئے — پہنچا ہوں میں کہاں سے کہاں اضطراب میں

(نوح ناروی)

بے پردہ کہہ رہی ہیں اداؤں کی شوخیاں — پنہاں ہے ایک ناز کی دنیا نقاب میں
وارفتۂ مجاز نہ ہو اے نگاہِ شوق — ناداں ہے آفتاب کہاں طشتِ آب میں

(عاشق ڈبائیوی)

پھر کچھ سکون سا ہے مرے اضطراب میں — لے برقِ بے پناہ چمک جا نقاب میں
آدابِ عاشقی کا کچھ ایسا لحاظ تھا — جی کھول کر تڑپ نہ سکے اضطراب میں

(صبا اکبر آبادی)

اک موجِ انقلاب بہالے گئی اُسے — جتنی ہوا بھری تھی دماغِ حباب میں
کیف آشنا ہو جس سے مرا نغمۂ حیات — مطرب وہ تار جوڑ دے اپنے رباب میں

(آرزو ڈبائیوی)

(منقول)

یادِ رفتگاں

مہاراجہ سر پربھو نراین سنگھ مرحوم

ہز ہائینس مہاراجہ سر پربھو نراین سنگھ صاحب بہادر جی۔سی۔آئی۔ای والیِ بنارس جن کا انتقال تقریباً چھہتّر سال کی عمر میں حال میں ہوا ہے بھوپہار برہمن تھے۔ اس خاندان کی بنیاد راجہ منسا رام نے ڈالی تھی جو نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں بنارس کے ناظم تھے۔ ۱۷۳۹ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند راجہ بلونت سنگھ ان کے جانشین ہوئے۔ ورا نے قوت بازو سے گرد و نواح کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ انگریزوں کو فوجی مدد دینے کے صلہ میں بکسر کی لڑائی کے بعد ان کا مفتوحہ علاقہ ان کے پاس رہنے دیا گیا۔ ۱۷۷۰ء میں راجہ بلونت سنگھ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے راجہ چیت سنگھ گدی پر بیٹھے مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مخالفت کی وجہ سے گورنر جنرل ہند وارن ہیسٹنگز نے ان کو معزول کر کے راجہ بلونت سنگھ کے نواسے راجہ مہیپ نراین کو تخت نشین کیا۔ لیکن صوبہ و شہر کا انتظام فوجداری و دیوانی اپنے ہی قبضہ میں رکھا۔ ۱۷۹۴ء میں راجہ مہیپ نراین نے اپنے علاقہ کا بہت سا حصہ جس میں اضلاع بنارس مرزاپور۔ غازی پور۔ بلیا اور جونپور شامل تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس شرط کے ساتھ حوالہ کر دیا کہ ضروری انتظامی مصارف کے بعد جو رقم بچے اُن کو دی جائے۔ باقی علاقہ ابھی تک خاندانی علاقہ کے طور پر مہاراجہ کے قبضہ میں ہے۔ ۱۷۹۵ء میں راجہ مہیپ نراین کا انتقال ہوا اور اُن کے فرزند راجہ اودت نراین سنگھ ان کے جانشین ہوئے، یہ ۱۸۳۰ء تک زندہ رہے جس کے بعد ان کے بھتیجے و متبنیٰ راجہ ایشری پرشاد نراین سنگھ بہادر مسند نشین ہوئے۔ انھوں نے غدر کے زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو قابل قدر امداد دی جس کے صلہ میں مہاراجہ بہادر کا خطاب پایا اور سلامی میں دو توپوں کا اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۷۷ء میں ان کو جی۔سی۔ایس۔آئی کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں وہ بھی رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے اور ان کے بعد ان کے بھتیجے اور پسر متبنیٰ مہاراجہ سر پربھو نراین سنگھ بہادر تخت نشین ہوئے۔

آپ ۲۶۔ نومبر ۱۸۵۵ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۱۲ جون ۱۸۸۹ء کو جب آپ کو گدی ملی تو مہاراجہ بہادر کا خطاب بطور ذاتی اعزاز اور ہز ہائینس کا لقب جو آپ کے چچا کو حاصل تھا آپ کو بھی عطا ہوا۔ ۱۸۹۲ء

کے قحط میں آپ نے اپنی رعایا کی نہایت فیاضی سے امداد کی جس کے صلہ میں آپ کو جی۔سی۔آئی۔ای کا خطاب ملا۔ مہاراجہ مرحوم کو رفاہ عام کے کاموں سے خاص طور پر دلچسپی تھی اور اُن کی پبلک خدمات کی داد برٹش گورنمنٹ وقتاً فوقتاً دیتی رہی ہے۔

آپ ایک عالم باعمل رئیس تھے۔ آپ کی فیاضی، رعایا پروری، نیک نفسی اور رحمدلی کے اکثر واقعات زبان زد خاص و عام ہیں۔ قابل لوگوں اور مستحق حاجتمندوں کی حاجت روائی میں آپ کو بہت مسرت حاصل ہوتی تھی۔ آپ اپنی رعایا کے رنج و خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ کی رعایا میں جب کسی خاندان میں موت ہوتی تھی تو مہاراجہ مرحوم اس کے جانشین کو دسویں کے روز ایک پگڑی بھیجتے تھے اور جب کسی کے یہاں شادی یا جنیو ہوتا تھا تو نوشہ کے لئے مبارکباد دیجاتی تھی۔ آپ کی ریاست کے دولتمند لوگ ہر اصلاح و خیر کے کام میں آپ کی رہنمائی کے خواہشمند رہتے تھے۔ غربا مصیبت کے وقت آپ کی امداد چاہتے تھے اور آپ کی ذات سے سب کی مرادیں پوری ہوتی تھیں۔

مہاراجہ مرحوم طبعاً بہت زندہ دل واقع ہوئے تھے وہ دنیاوی معاملات اور معمولی آدمیوں کی مشکلات کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی ریاست میں آپ نے حاکم و محکوم کے مابین کسی قسم کی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رکھی تھی اور رعایا کی درخواستوں کی خود بنفس نفیس سماعت فرماتے تھے

درحقیقت مہاراجہ مرحوم بنارس کے روح رواں تھے۔ کاشی کی ہر مفید عام تحریک میں آپ کا قدم آگے رہتا تھا۔ میلوں اور تہواروں کے موقعوں پر آپ عوام کی رہنمائی کرتے تھے۔ بنارس میں موسم بہار میں بوڑھوا منگل کا تہوار جس تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے اس کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے، پانچ دن تک لوگ دریا میں کشتیوں پر لہو و لعب میں مشغول رہتے ہیں، دریا بھی اُن کی خوشی میں شرکت کر کے کاشی کے مشرقی کنارے پر کلیلیں کرتا نظر آتا ہے۔ آسمان ترانوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ طرح طرح کے پھول پنکھڑیوں سے گنگا کا کنارہ معطر ہوجاتا ہے۔ مہاراجہ کی کشتی گھوڑوں اور طاؤسوں سے آراستہ ہوکر اور خاندانی دیوتاؤں کو لیکر رام نگر کی جانب سے روانہ ہوتی ہے اور اُن جاتریوں سے ملاقات کے واسطے جو بیچ گنگا سے اسی گھاٹ آتے ہیں آگے بڑھتی ہے۔ اس وقت ہر خاص و عام کی زبان پر یہی کلمہ ہوتا ہے کہ "مہاراجہ صاحب تشریف لارہے ہیں" پھر رام لیلا کا موقع موسم خزاں کا پیغام لاتا ہے، یہ رام نگر کا سب سے بڑا تیوہار ہے، مہاراجہ صاحب اس موقعہ پر بلاناغہ میلہ میں شریک ہوتے ہیں۔ اہل بنارس دریا کو عبور کر کے شری رام چندرجی کے درشنوں کو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں آکر جمع ہوتے ہیں۔ بنارس کا بھرت ملاپ بھی ہندوستان کے بہت بڑے میلوں میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اس

موقعہ پر رعایا مہاراجہ کے ساتھ اپنے جذبات دلی کا اظہار کرتی ہے جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اب بھی ہندوستان میں مذہب میں کس قدر زور اور اثر ہے۔ مہاراجہ مرحوم حسبِ دستور ان موقعوں پر رونق افروز ہوتے اور اہل بنارس سے خراج تحسین لیتے تھے۔

آپ پکّے سناتن دھرمی تھے، وہ قدیم ہندو دھرم کے مخزن خیال کئے جاتے تھے۔ لیکن آپ اُن سناتن دھرمیوں میں نہیں تھے جو اصلاح کے سخت مخالف ہوتے ہیں، چنانچہ جب کبھی بنارس کے رجعت پسند پنڈت کسی اصلاحی تحریک میں روڑے اٹکانے کی فکر کرتے تو مہاراجہ صاحب کمال دانش مندی سے اعتدال کا درمیانی راستہ اختیار کرتے تھے جس سے تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی آپ ہردلعزیز ہو گئے تھے۔ آپ قدردان علوم وفنون اور ہندو یونیورسٹی کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ سنسکرت کالج میں مذہبی عنصر آپ ہی کی بدولت قائم ہوا۔ اُن کا قول تھا کہ جو شخص برہمن نہیں ہے اُس کو مذہبی تعلیم دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اُن کے خیال میں منوجی کے قول کے مطابق ہر شخص تعلیم اور طریقۂ زندگی کے لحاظ سے برہمن کا درجہ پانے کا حقدار تھا۔ اس مسئلہ پر اکثر بحث ومباحثہ ہوا مگر مہاراجہ مرحوم اپنے عقیدہ پر برابر قائم رہے اسی رواداری اور وسیع الخیالی کی بدولت آج آپ کی وفات پر ہر طبقہ کے لوگوں کو دلی افسوس ہے۔

آپ کے بعد آپ کے ولیعہد کنور اُدت نراین سنگھ صاحب گدی پر بیٹھے ہیں۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۶ر نومبر ۱۸۷۵ء ہے اور آپ مہاراجہ مرحوم کے زیر سایہ تعلیم وتربیت نیز کافی تجربہ حاصل کر چکے ہیں اُمید ہے کہ آپ اپنے والد مرحوم کے قدم بقدم چلکر اپنے خاندان کا نام بدستور روشن رکھیں گے۔

ریاست بنارس کا رقبہ نوسو پچاسی مربع میل اور آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے، ریاست کی سالانہ آمدنی قریب پندرہ لاکھ روپیہ ہے۔ ریاست کی فوجی طاقت ایک سو پچاس سوار، پانچسو پیدل اور پچاس توپچی پر مشتمل ہے اور تیرہ ضرب توپ سلامی مقرر ہے۔

مسٹر ایس۔ خدابخش مرحوم

مسٹر ایس۔ خدابخش مرحوم جن کا انتقال اگست ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتہ میں ہوا ہے ایک غیر معمولی قابلیت کے شخص تھے۔ قدرت نے اُن کو بڑی فیاضی کے ساتھ ذہنی ودماغی قوتیں عنایت کی تھیں۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی مرحوم کو انگلستان بھیجدیا گیا تھا جہاں وہ سات سال تک متواتر آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد ایم۔ اے اور بیرسٹری کی سندیں حاصل کرکے ۱۸۹۹ء میں ہندوستان واپس آئے

اور ڈھاکہ میں بیرسٹری شروع کی، پھر ۱۹۰۱ء میں کلکتہ چلے گئے جہاں تھوڑی ہی مدت میں آپ کی قانونی قابلیت کا شہرہ ہوگیا اور فوجداری عدالتوں میں آپ خاص وقعت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ بہرحال اسی سال آپ کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوگئے اور بعدازاں قانونی کالج کے پروفیسر اور یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔

مسٹر خدابخش مرحوم اُردو۔ فارسی۔ عربی اور انگریزی زبانوں کے ماہر ہونے کے علاوہ قدیم یونانی ورومی زبانوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انگریزی زبان پر آپکو غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ آپ کے علمی و ادبی انہماک کا بہترین ثبوت آپ کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں اور جو سب کی سب انگریزی میں ہیں

(۱) تاریخ تہذیب اسلام	مطبوعہ ۱۹۰۵ء	(۵) عہد خلفا کی تہذیب	۱۹۲۰ء
(۲) ہندوستانی اور مسلم (مضمون)	۱۹۱۲ء	(۶) سیاست اور اسلام	۱۹۲۰ء
(۳) مسلمانوں کی تاریخ	۱۹۱۴ء	(۷) تحفۂ محبت	۱۹۲۳ء
(۴) روایتیں اور کہاوتیں	۱۹۱۶ء	(۸) تہذیب عرب	۱۹۲۶ء

(۹) ہندوستانی اور اسلامی مطالعہ ۱۹۲۷ء۔ یہ آخری رسالہ ہے جو مرحوم نے تالیف کیا تھا۔ اس میں مہاتما گاندھی، سرآسوتوش، سی۔آر۔ داس وغیرہ کے طرز معاشرت وغیرہ کا قابل قدر ذکر ہے۔

مرحوم ایک مدت سے ایک مبسوط کتاب "روشنیِ اسلام" کے نام سے لکھ رہے تھے۔ اس کی تکمیل کے ساتھ ان کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں مگر افسوس یہ کارِ عظیم تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔

مستقل تصانیف کے علاوہ آپ اکثر ملکی۔ قومی اور ادبی مسائل پر قابل قدر مضامین بھی لکھتے تھے آپ کی علمی دلچسپی کی بہترین یادگار پٹنہ کی مشہور و معروف "خدابخش لائبریری" ہے جس میں نادر ونایاب کتابوں کا نہایت قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔

آپ نہایت با اخلاق اور ملنسار۔ صاف باطن و صاف گو واقع ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے ہر مذہب و ملت کے افراد سے آپ کے تعلقات دوستانہ تھے اور سب اُن کی عزت کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے محفلِ علم و ادب میں ایک ایسے فرد کی کمی ہوگئی ہے جس کا جانشین ذرا مشکل سے پیدا ہوگا۔ ہم مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں اور پسماندگان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

علمی خبریں اور نوٹ

خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد اپنے اولوالعزم سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کی حُسنِ کوشش سے برابر ترقی کررہی ہے جس کا ثبوت سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء کی رپورٹ کارگزاری سے ملتا ہے۔ جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس انجمن کو اعلیٰحضرت نظام دکن کے علاوہ سو سے زیادہ اہل علم حضرات کی اعانت و سرپرستی حاصل ہے۔ اس کے ارکین کی تعداد ایک سو ۱۷۹ اناسی ہے۔ اسکی ترانوے شاخیں اور کتبخانے ملک کے ہر گوشہ میں قائم ہیں۔ پچھلے دو سال کی مدت میں بارہ کتابیں انجمن کے اہتمام سے شائع ہوئی ہیں اس وقت گیارہ زیر طبع اور سات اور کتابیں تیار ہیں۔ "اردو" اور "سائنس" نام سے اس کے دو سہ ماہی رسالے برابر آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں، انجمن نے اپنا ذاتی ٹائپ کا پریس بھی قائم کرلیا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کی سعی بلیغ سے اس کی مالی حالت بھی قابل اطمینان ہے۔ اس وقت چھبتیس ہزار روپیہ کا "محفوظ سرمایہ" اس کے پاس موجود ہے، آمدنی خرچ کی یہ کیفیت ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں عطیات و فروخت کتب وغیرہ سے تینتالیس ۴۳ ہزار پانسو باسٹھ روپیہ وصول ہوا اور چالیس ہزار نو سو ستتر روپے خرچ ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے مصارف کا تخمینہ بیالیس ۴۲ ہزار چار سو روپیہ کیا گیا ہے۔ ہم اس قابل قدر کارگزاری پر انجمن کے پرجوش اسٹاف کو تہِ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ سکریٹری کے علاوہ منشی حسن صدیق صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن و مینیجر مطبع ترقی اردو بھی جس شوق و انہماک سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہیں وہ بہت قابل قدر ہے۔

امپیریل لائبریری کلکتہ میں اس وقت تقریباً تین لاکھ کتابیں موجود ہیں اور اس کے دارالمطالعہ سے روزانہ ایک سو پچیس آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب اس لائبریری کو وہ حق عطا کئے جانے کی کوشش ہو رہی جس کی رو سے حدود ہند میں شائع ہونے والی ہر کتاب کی ایک ایک جلد اس کو مفت

ملا کرے گی۔ اب تک ہندوستان میں کسی لائبریری کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ اگر اس لائبریری کو یہ حق حاصل ہو گیا جس کی امید قوی ہے تو اس میں رفتہ رفتہ ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں کا ذخیرہ ہو جائیگا اور اہل علم کی بہت سی مشکلات دُور ہو جائیں گی۔ ہماری رائے میں ہندوستان کے ہر صوبہ میں کم سے کم ایک لائبریری کو حکومت کی طرف سے یہ حق حاصل ہونا چاہیئے۔

مہاتما گاندھی کے اخبارات ینگ انڈیا اور نوجیون کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں شائع ہوا کرتا ہے۔ حال ہی سے اُردو نوجیون کے نام سے ان پرچوں کا اُردو ترجمہ بھی دہلی میں طبع ہونے لگا ہے۔ شائقین تین روپیہ سالانہ میں نوجیون پریس دہلی سے اس رسالہ کو منگا سکتے ہیں۔

نول کشور پریس لکھنؤ صوبہ کا ایک قدیم و مشہور مطبع ہے جس کو مرحوم منشی نولکشور صاحب سی۔ آئی۔ ای نے ۱۸۵۸ء میں قائم کیا تھا۔ ابتک اس مطبع میں تقریبًا چالیس ہزار کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ عربی اور سنسکرت کی پرانی مذہبی کتابوں کی ایک بہت بڑی تعداد محض اسی مطبع کی اُلوالعزمی کی بدولت لوگوں کو دستیاب ہو رہی ہے۔ کسی وقت یہ مطبع ایشیا کا سب سے بڑا مطبع سمجھا جاتا تھا اب بھی یہ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کا سب سے بڑا پریس ہے اور اُردو کا اہم روزانہ "اودھ اخبار" پچھتر سال سے اسی مطبع سے شائع ہو رہا ہے منشی نولکشور مرحوم نے اپنے وقت میں اس مطبع میں بڑے بڑے اہل علم و اہل فن یکجا کئے تھے۔ اب بھی صوبہ کے بیشتر نامور اہل قلم اس مطبع کی علمی خدمت کر رہے ہیں۔ کئی سال سے ہندی کا مشہور رسالہ 'مادھری' بھی غیر معمولی اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ جنوری گذشتہ میں منشی بشن نراین صاحب بھارگو مالک مطبع کے بے وقت انتقال کی وجہ سے اب اس مطبع کا انتظام محکمہ کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہوا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ نئے انتظام میں بھی اس نامور کارخانہ کی قدیم روایات اور شاندار خصوصیات قائم رہیں گی۔

انگریزی زبان کے نامور شاعر براؤننگ کی نظموں کا دنیا کی چھبیس ۲۶ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اب امریکہ کے پروفیسر آرم اسٹرانگ ان نظموں کا چینی زبان میں ترجمہ کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر شریدھر وینکٹیش کیتکر ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی ملک کی مختلف زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا کی تالیف میں مہارت تامہ حاصل کر چکے ہیں، چنانچہ آپ مرہٹی زبان میں ایک انسائیکلو پیڈیا تیئس ۲۳ جلدوں

میں مکمل کر چکے ہیں - آجکل اس کو گجراتی زبان میں شائع کرنے کا انتظام ہو رہا ہے بلکہ اس کی پہلی جلد طبع ہو چکی ہے اور دوسری زیر طبع ہے۔ اب موصوف کا ارادہ ہے کہ گیان کوش کے نام سے ہندی میں بھی سائیکلوپیڈیا مکمل ہو جائے۔ چنانچہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی سرپرستی میں اس کے متعلق ایک علٰحدہ کمپنی قائم ہو گئی ہے جس کا نام ہندی گیان کوش منڈل لمیٹیڈ قرار دیا گیا ہے، ضروری سرمایہ کی فراہمی اور اڈیٹروں، نامہ نگاروں وغیرہ کی تقرری اسی کمپنی کے ذمہ ہو گی۔ یہ انسائیکلوپیڈیا پچیس جلدوں میں تمام ہو گی اور ہر جلد میں سوا تین سو صفحات ہونگے۔ خیال ہے کہ چار سال میں پوری کتاب شائع ہو جائیگی

حیدر آباد دکن کے مسٹر محمد فتح اللہ خاں حضرت عمر فاروق کے زمانۂ خلافت کے آئین و قوانین کے متعلق انگریزی زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھ رہے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس موضوع پر اپنی مشہور و معروف تصنیف "الفاروق" میں سیر حاصل بحث کی ہے جس کا ترجمہ ترکی زبان میں بھی ہو گیا ہے مگر انگریزی میں اس مضمون پر کوئی اعلیٰ پایہ کی کتاب موجود نہیں ہے۔ امید ہے کہ مسٹر محمد فتح اللہ خاں کی کوشش سے یہ کمی پوری ہو جائیگی۔

بنگال کے شری یت کمود ملک نے فن تحریر کا ایک نادر نمونہ پیش کیا ہے، آپ نے ایک پوسٹ کارڈ پر ۵½ × ۳½ انچ کی محدود گنجائش میں تین سو تینتیس ۳۳۳ سطریں جن میں بارہ ہزار الفاظ ہیں صاف و خوشخط لکھی ہیں یہ کارڈ شری یت اسونی پال کے تصویر خانہ میں رکھدیا گیا ہے اور کمود بابو نے چیلنج دیا ہے کہ کوئی بابو اتنی مختصر جگہ میں اس سے زیادہ الفاظ لکھکر پیش کرے۔

صوبۂ دہلی کے بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے اجلاس منعقدہ مئی ۱۹۳۱ء میں ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا گیا تھا کہ ہائی اسکول کے طلبا کو کوئی نہ کوئی ہندوستانی زبان لازمی مضمون کے طور پر پڑھنا پڑیگا بحث و مباحثہ کے بعد اور بعض حضرات کی مخالفت کے باوجود یہ تجویز کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔

تہذیب نسواں (لاہور) مشہور ہفتہ وار اخبار ہے جو چونتیس ۳۴ سال سے برابر نسوانی دنیا کی ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں اس اخبار کا سالگرہ نمبر نہایت آب و تاب کے ساتھ باتصویر شائع ہوا ہے اس کا حجم نوے صفحات ہے اور اس میں نظم و نثر کے تقریبًا

چالیس مضامین ہیں۔ مضامین عموماً مفید و دلچسپ ہیں جن کے مطالعہ سے تعلیم یافتہ خواتین نیز اوسط درجہ کی قابلیت کی لڑکیاں بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتی ہیں۔ مضامین کے علاوہ مختلف قسم کے کھانے پکانے اچار اور مربے بنانے نیز کشیدہ کاری وغیرہ کے متعلق ضروری باتیں درج ہیں اور آخر میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے سیاسی معاملات کے متعلق بھی مختصر نوٹ ہیں۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ نمبر کامیاب و لائق مطالعہ ہے۔ تہذیب نسواں کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے۔ شایقین دارالاشاعت پنجاب لاہور سے طلب فرمائیں۔

تصاویر آنریبل مسٹر پی۔ سی۔ راماسوامی آئر حال ہی میں قائم مقام مشیر قانون گورنمنٹ ہند مقرر ہوئے ہیں۔ آپ صوبہ مدراس کے مشہور کانگریس لیڈر اور قابل ترین ماہر قانون ہیں۔ جن کی قابلیت کا بارہا امتحان ہو چکا ہے۔ سیاسی میدان میں آپ ایک عرصہ سے اہل ملک کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے مسز بیسنٹ کے ہوم رول ایجی ٹیشن میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ مسٹر مانٹیگو سابق وزیر ہند اپنے دورہ ہند میں آپ کی اعلیٰ ذہانت و قابلیت سے بہت متاثر ہوئے تھے چنانچہ اس کا مفصل ذکر انھوں نے اپنی ڈائری میں بھی درج کیا ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ مسٹر راماسوامی ۱۹۱۹ء میں کانگریس کے سکرٹری تھے اور اسی حیثیت سے جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی ساؤتھ بورو کمیٹی اور میسٹن کمیٹی کے روبرو آپ کی شہادتیں ہوئی تھیں جن کی وجہ سے آپ کی نکتہ دانی اور معاملہ فہمی کی شہرت دُور دُور پھیل گئی اور گورنمنٹ نے آپ کو ۱۹۲۰ء میں مدراس کا ایڈوکیٹ جنرل مقرر کر کے اپنی قدر دانی کا ثبوت دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد آپ کو لارڈ ولنگڈن نے (جو اُس وقت گورنر مدراس تھے) مدراس گورنمنٹ کا مشیر قانون مقرر فرمایا۔ چنانچہ آپ کے زمانہ لاممبری میں مدراس گورنمنٹ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا قابل قدر نمونہ بن گئی تھی۔ ۲۷-۱۹۲۶ء میں آپ کو لیگ آف نیشن جنیوا کے اجلاسوں میں ہندوستان کے قائم مقام کی حیثیت سے شریک ہونے کا موقعہ دیا گیا۔ یہاں بھی آپ نے اپنی معاملہ فہمی و حب الوطنی کا سکّہ دلوں پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں آپ نے بٹلر کمیٹی کے روبرو بعض ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے وکالت کا حق اس خوبی سے ادا کیا کہ والیان ریاست نے بالآخر اپنی تمام آئینی گتھیوں کے سلجھانے کا کام آپ ہی کے سپرد کر دیا۔ پچھلے سال کی گول میز کانفرنس کی فیڈرل کمیٹی میں بھی آپ کی قابلیت و فصاحت و بلاغت اہل ملک کے کام آئی تھی۔ بہرحال ایسے لائق محب وطن کو اپنا مشیر قانون منتخب کر کے ہز ایکسیلنسی لارڈ ولنگڈن نے ہندوستان پر احسان عظیم کیا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ سابق کی طرح آپ اس نازک وقت میں بھی ملک کی اہم سیاسی خدمات انجام دے سکیں گے۔

اعلیحضرت نظام اور لارڈ ارون کا گروپ سابق وائسرائے ہند کے دورہ حیدرآباد کے موقعہ کا مرقع ہے۔ اعلیٰ حضرت کے

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

بزم خیال

اس میں اردو اور فارسی شعراء کی مجالس کے لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے جمع کئے گئے ہیں جو خوش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین سامان ہے۔

قیمت

صرف ایک روپیہ

مرقع ادب

حصہ اول و دوم مرتبہ جناب مقصود مرزا پوری اس میں ہندوستان کے مشاہیر انشا پرداز و شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں قیمت

حصہ اول ۱۲ / حصہ دوم ۱ / ۶

خاک پروانہ

منشی پریم چند کی تازہ ترین چودہ منتخب کہانیوں کا مجموعہ - پریم چند صاحب کے افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں - قیمت ایک روپیہ عہ /

بہرام کی رہائی

نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اس کتاب کا پڑھنا نہایت ضروری ہے - قیمت ایک روپیہ چار آنے ۱ / ۴

انتخاب اودھ پنچ

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو گذشتہ ۱۸... میں اس میں شائع ہوئے تھے۔ علاوہ اس کے بہت سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے

قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱ / ۸

خیالات عزیز

مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جس کی باضابطہ رجسٹری ہوگئی ہے - حجم دو سو صفحات۔ سرورق پر مصنف کی تصویر۔ ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے - لکھائی چھپائی اعلیٰ۔

قیمت صرف ایک روپیہ عہ /

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مشہور و مقبول دیوان ہے جو حال میں حسن و خوبی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ داغ صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں

قیمت بلحاظ دیوان

صرف

ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱ / ۸

مثنوی سحر

یعنی شکنتلا و دشینت منظوم حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز

اول ایڈیشن کی قیمت چھ آنے

دوسرے ایڈیشن کی قیمت جسکی مصنف نے نظر ثانی بھی کی ہے

صرف

آٹھ آنے ۸ /

منیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمائیے

زمانہ بک ایجنسی کی دلچسپ قابل دید کتابیں

نصائح چانکیہ

یعنی نامور ہند چانکیہ کے مشہور و معروف دلچسپی کا ترجمہ از جناب پنڈت ہمنت راؤ صاحب مددگار خزانہ سرکار عالیہ گورنمنٹ نظام دام اقبالہٗ قیمت ۶/

قومی نمبر رسالہ زمانہ

جسمیں ۲۷ قابل دید مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر اور مہاتما گاندھی لالہ لاجپت رائے ڈاکٹر سپرو مسز نائیڈو ڈاکٹر اقبال کے خاص پیغامات اور بہت سے قابل دید مضامین نظم و نثر شائع ہوئے ہیں قیمت عہ/

پریم بتیسی

یعنی اردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند بی اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے حصہ اول ۱۲/ دوم ۱۲/

سیر المصنفین

اردو انشاپردازی کی مکمل تاریخ از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب بی۔اے شعرا کی

طرح نثاروں کا جامع تذکرہ ...

گلکدہ

لسان الملک حضرت عزیز لکھنوی کا مجموعہ کلام حسن یا صفحہ ایک حسین گلزار اور ہر شعر ایک خوشرنگ پھول ہے قیمت صرف عہ/

اثرستان

ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پرتاثیر اور ہر شعر تر و نشتر ہے قیمت عہ/

دنیائے راز

از ابو الفضل راز چاندپوری قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہے ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف قیمت صرف ایک روپیہ

بندگی

مجدد اعظم امام ابن عربی کی کتاب العبودیت کا اردو ترجمہ جسمیں حقائق دینی عقائد اسلامی اصول توحید اور تصوف سے صحیح مفہوم پر قابل ... قیمت ۲/

لسان الغیب

شرح دیوان حافظ ... [illegible]

... سے الخمری ... سے مشہور اہل قلم حضرات کی رائے سے ... یکتائی کے ... یہ کتاب ... گئی ہے قیمت جلد اول ...

کاس الکرام

شرح رباعیات عمر خیام مع مفصل سوانحعمری تمام ارباب سخن کا اس پر اتفاق ہے کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ مکمل اور بہتر کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی قیمت ...

اردو مضمون نویسی

مضمون لکھنے کے متعلق بابو ... پرشاد بی اے پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب ہے اس سے بہت جلد اردو لکھنے کی مہارت پیدا ہوجاتی ہے قیمت ۸/

مکمل عورت

دو لڑکیوں کی تعلیمی و سوشیل حالات کا مقابلہ ایک کو یورپین اسکول اور دوسری کو کنیا ودیالیہ میں داخل کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ کنیا ودیالہ کی لڑکی تعلیمی و سوشیل حالت میں بہتر ہے ۸/

بزم احباب

اخلاقی کہانیوں کا گنجینہ ۸/

طریق دولتمندی

یہ کتاب ہر شخص کے قابل خرید ہے دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے کم لوگ واقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں۔ قیمت ۸/

یادگار قومی

جس میں ملک کے مشہور ترین انشاپردازوں کے ۱۵ مضامین اور چار عکسی تصویریں ہیں کاغذ لکھائی چھپائی صاف ہے قیمت ایکروپیہ

ترجمہ رامائن منظوم

بال کانڈ اصلی دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اردو اشعار میں مترجمہ سورج پرشاد تصور ۱۲/

روشنی رانی

جس میں حسن و عشق کی سچی داستان راز دنیا کا دلچسپ نقشہ اور تریاہٹ کی دلکش مثال موجود ہے ۶/

حیات بیوہ

جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت زار کا سچا فوٹو ... قیمت ۸/

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے منگائیے

ALETRIS CORDIAL RIO
THE WOMAN'S TONIC
الٹرس کارڈی آیل
ڈاکٹر اس کو جسمانی صحت کیلئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اسکا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بیٹی اور بہن کے واسطے بہترین دوائی
Rio Chemical Co.
79 BARROW STREET
NEW YORK (U.S.A)

پچاس سال کی رائج ہندوستانی پٹینٹ دوائیں

مرض کا گھر کھانسی!

کف کف (REGD)

(کف۔ کھانسی و سردی کی لاجواب دوا)

پیتے ہی کھانسی کو دباتی اور کف کو پتلا کرتی ہے

کھانسی نہایت خوفناک مرض ہے۔ اسے کبھی خفیف نہ سمجھیں "کف" کے پیتے ہی کھانسی دب جاتی ہے کف خواہ کھانسی کی کیسی ہی بیماری کیوں نہ ہو اُسے یہ دوا آرام کرنے کا دعویٰ رکھتی ہے۔

قیمت کلاں شیشی ایک روپیہ چھ آنہ عہ ڈاک محصول نو آنہ ۹ر خورد شیشی بارہ آنہ ڈاک محصول چھ آنہ ۶ر

ہیلک صابن (REGD.)

(دوا آمیز خوشبودار)

آپ عمدہ سے عمدہ ولایتی صابن کے بجائے روزانہ اسکا استعمال کرسکتے ہیں۔ اس کے متواتر استعمال سے جلدی بیماریوں کے ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا اور خارش، خسرہ، پھنسی، مہاسہ، برن اور جلدی خشکی وغیرہ رفع ہوتی ہے۔

قیمت فی ٹکیہ سات آنہ ۷ر ڈاک محصول ۶ر

نمونہ صرف دو آنہ ۲ر

ہیلک مرہم (REGD)

(کٹے جلے۔ چوٹ وغیرہ پر لگانے کا مشہور مرہم)

"ہیلک" سے حادثہ زدہ چوٹ، زخم، سوزش، ورم، بہتا ہوا خون، آگ سے جلنے کا زخم فوراً آرام ہوتا ہے۔ فٹ بال، کرکٹ، جمناسٹک، کسرت وغیرہ کے کھلاڑیوں کو اور کارخانے میں کام کرنیوالوں کو اسے ہمیشہ پاس رکھنا چاہیئے۔

اس میں چربی وغیرہ ناپاک چیز نہیں ہے۔ قیمت فی ڈبی ۱۰ر دس آنہ۔ محصول ڈاک تین ڈبی تک چھ آنہ ۶ر

نمونہ کی ڈبی صرف دو آنہ ۲ر

نوٹ:۔ ہماری دوائیں ہر مقام میں دواخانوں میں فروخت ہوتی ہیں بغرض کفایت ڈاک محصول اپنے مقامی ہمارے ایجنٹوں سے خریدیں

صیغہ نمبر (۶۷) پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ: چھوٹے لال اینڈ سنس کلکٹر گنج۔ کانپور

اپنے دوستوں میں بیماری نہ پھیلاؤ

اس سردی زکام کو دفع کیجئے

انسانی یا گرد سے بے پروائی سانس لینے کی نازک
نالیوں اور پھیپھڑوں کیلئے سخت خطرہ کا باعث ہوتی ہے
اسکا نتیجہ اکثر برانکائٹس، دمہ، یا سینہ کی دوسری سخت بیماریوں
کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بے وجہ خطرہ میں نہ پڑیئے!
سردی لگتے اور زکام ہوتے ہی سانس کے ساتھ اندر
جانے والی پیپس کی ٹکیاں کھائیے اور سخت خطرات سے
بچے رہیئے۔ جیسے ہی پیپس کی ٹکیہ منہ میں گھلتی ہیں اس سے
مقوی صحت بخش اور جراثیم کش بخارات نکلتے ہیں جو سانس
کے ساتھ سیدھے پھیپھڑوں تک چلے جاتے ہیں۔ پیپس حلق
کو تسکین دیتی ہیں اور سانس لینے والی نالیوں کی اندرونی
جھلی کے ورم کو صحت بخشتی ہیں۔ یہ جراثیم کو نیست و نابود
کرتی، بلغم کو ڈھیلا کرتی اور کھانسی و زکام کو دفع کر دیتی ہیں

سانس کے ساتھ اندر جانیوالی حیرت انگیز ٹکیاں

تمام انگریزی دوا فروش پیپس فروخت کرتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ
ایجنٹ: میسرز کے۔ بی۔ محمد سعید اینڈ کو۔ مسٹن روڈ۔ کانپور

پیپس
Peps

سناٹوجن کے استعمال سے

جوانی کی سی طاقت دوبارہ حاصل کیجئے

جو آدمی سناٹوجن استعمال کرتا ہے اسکو جلد معلوم ہوجائیگا کہ
جوانی کی سی طاقت اور قوت مردمی اسکو دوبارہ مل گئی ہے کمزوری
اور ناطاقتی جاتی رہی ہے اور اب اسکو معلوم ہوتا ہے کہ طاقتور
اور تندرست خون کا ایک دریا اُس کی رگوں میں موجزن ہے
سناٹوجن استعمال کرنیوالا طاقتور اور چست ہوکر اپنی زندگی
کے ہر ایک لمحہ کو پورے طور پر کام میں لائیگا
سناٹوجن کی یہ خاصیت ہے کہ وہ جسم میں اس قدر زیادہ قوت
پیدا کرتی ہے۔ اس لئے کہ سناٹوجن میں وہی اصلی اجزا
ہوتے ہیں جو جسم کو تازہ اور تندرست خون دینگے۔
سناٹوجن کی ایک شیشی آج ہی خرید کر لیجئے۔
تھوڑی سی مدت ہی میں آپ بے انتہا تندرستی اور
مردانہ قوت محسوس کرنے لگیں گے۔

SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام انگریزی دوا فروشوں سے اور بازار میں ملتی
یہ ہاتھ سے نہیں چھوئی جاتی

پنڈت شری کالیہ پرنٹر پبلشر حالی پرنٹنگ پریس کا چھپا — پنڈت نرائن ٹنکر ایڈیٹر و پبلشر